

صالحه

پاکستان
رضیہ
دانش

دوبلا چہ

”مداختہ صرف ایک ناول ہی نہیں بلکہ ایک حقیقت بھی ہے۔ اور میں نے اس ناول میں اپنی پوری کوششیں صرف کر دی ہیں۔ کہ کہیں بھی میرے پڑھنے والوں کو احساس نہ ہو کہ وہ ایک ایسے ناول کا مطالعہ کر رہے ہیں جو حقیقت کم اور افسانہ زیادہ ہے۔ میں نے اسے افسانہ کم اور حقیقت زیادہ بنا دیا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے درست ہے۔“

کچھ عرصہ سے مارکیٹ سے خواتین لکھنے والیوں کے ناولوں کی بھرمار ہے۔ اور ناولوں کی اس موسلا دھار بارش میں میں نے ایک نئے ناول کا اضافہ کر دیا ہے۔ اس طرح اس ناول کی حقیقت بھی بارش کے ایک قطرے سے زیادہ نہیں۔ مگر میں نے ہمت نہیں ہاری۔ بلکہ ناول کو ہر حالت میں مارکیٹ میں اپنے وقت پر پیش کر دیا ہے۔ خدا کرے یہ بھی آپ کو پسند آئے۔ اور میری محنت کارت نہ جائے۔

ناول کے سلسلے میں مجھے بہت سے لوگوں نے کہا۔ کہ وہ ایسے گھراؤنی

مشکوٰۃ متوسط میں کسی کے لئے کی دلچسپی کا باعث بنتا ہے۔ ایک انتہائی
امیر اور ایک انتہائی غریب گھرانے کا ٹکراؤ خوب ہوتا ہے۔ مگر مجھے
احساس تھا کہ یہ حقیقت زیادہ اور کہانی کم ہے۔ اور میں حقیقت
کو اضافی رنگ دینے کی عادی نہیں ہوں۔ !

میں ان تمام اصحاب کا شکریہ ادا کرنا..... اپنا سفر من خیال
کرتے ہوں جنہوں نے مجھے اپنی ناول کے سلسلے میں کوئی بھی مدد دی۔
اور میں مسٹر بلخ الدین جاوید کی بھی بے حد شکریہ گزار ہوں۔ جنہوں
نے بے شمار دشواریوں کے باوجود ہر مشکل کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔
اور میرے ناول کو شائع کر دیا۔ اب میں آپ کے اور ناول کے
درمیان زیادہ دیر حائل رہنا نہیں چاہتی۔

خدا حافظ

رضیہ بیٹ دختر ایم ڈی بیٹ
نور شاہ روڈ لاہور

عرض ناشر

رضیہ بیٹ کا ناول سالہ پیش خدمت ہے۔ میں اس
ناول کے بارے میں اگر کوئی بات کہوں بھی تو وہ میری ذاتی رائے
سے زیادہ حیثیت نہیں رکھے گی۔ اور میری رائے کو اس دجہ سے
کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ کہ ناول آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اور
آپ خود ذوقِ سلیم کے مالک ہیں۔ آپ کا فیہ لہ بہ سہل آخری
ہو گا۔ مگر جہاں تک میری ذاتی رائے کا تعلق۔ ناول میں وہ
سبھی کچھ موجود ہونا چاہیے تھا۔ جس کے آپ متدانشی ہیں۔ اور جو
آپ کے لئے دلچسپی کا باعث ہو سکتا ہے۔ !

میں نے کچھ ایک نیا نام ہے۔ اور اسی طرح کہانی بھی نئی
ہے۔ ناول میں معصوم تہمتیں بھی ہیں اور معصوم سسکیاں بھی۔ محبت
کی بے قراری بھی ہے اور عشق کا اضطراب بھی۔ مگر اس کا اندازہ کچھ
ایسا ہے۔ کہ کم از کم میں نے تو اردو ادب کے کسی بھی ناول میں

نہیں پڑھا۔

یوں لگتا ہے مصنفہ یورپ کی مشہور مصنفہ پل ایس بک سے جسے ادب کا نوبل انعام مل چکا ہے۔ متاثر ہے۔ اور اس کی تحریر میں پختگی موجود ہے۔ جسے فن کی معراج کہا جاتا ہے۔ مصنفہ نے مشکل سے مشکل بات کرتے وقت ایسے سادہ الفاظ استعمال کئے ہیں کہ ایک دم قاری چونک بڑتا ہے۔ اور اس کے منہ پر تحسین کے الفاظ خود بخود نمودار ہوتے ہیں۔

گھر بلو ماحول کسی ایسے گھرانے کا ماحول محسوس نہیں ہوتا جسکا وجود غفاً معلوم ہو۔ بلکہ ماحول خالص گھر بلو اور عام سا لگتا ہے۔ اور پڑھنے والا سوچنے لگتا ہے کہ یہ اس کے اپنے گھر کا ماحول ہے۔ یا اگر اپنے گھر کا ماحول نہیں تو کم از کم اپنا ماحول ضرور ہے۔

ناول میں ایسی کوئی بھی بات نہیں ہے کہ اسے ٹھیکے کے نیچے چھپا یا جائے۔ یا والدین اپنے بچوں کے ہاتھ سے چھین لیں۔ ناول میں پاکیزگی، محبت، حسن اور مصدومیت ہر طرح بکھری ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اور اسکی خیالی میں ناول کا یہی وہ خاص انداز ہے جس نے مجھے قائل کر دیا ہے۔

مصنفہ نے ناول کے بارے میں دعوے کیا ہے کہ یہ کہانی سے زیادہ حقیقت پر مبنی ہے اور میرا خیال ہے کہ اگر یہ

حقیقت سے زیادہ کہانی پر بھی مبنی ہو تو تب بھی یہ ہم سب کی اپنی کہانی ہے۔ اس میں کوئی بھی بات غیر انوس نہیں! میں مزید کوئی بات کہنا نہیں چاہتا۔ صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ ناول کے بارے میں اپنی رائے سے ضرور نوازئیے گا۔

آپ کا

بلین الدین جاوید

مالک ایئرٹن پبلشرز۔ لاہور۔



بکھٹ بکھٹ بکھٹ -

دروازے پر دستک ہوئی۔

اُدئی اللہ یہ کون آیا۔ اس وقت یہ نامرہ نے کہا ایک یہ منی کی سچی ہے

کہ چپ ہونے کا نام نہیں لیتی۔

بکھٹ بکھٹ بکھٹ -

دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ دستک دینے والا شاید زبان سے

بات کرنے کے بجائے دعویٰ سے بات کرنا زیادہ پسند کرتا تھا۔ آتی ہوں

نامرہ وہیں سے چلائی۔

اور بڑے کمرے کے قالین پر مٹی کو ٹا کر دروازہ کھولنے کے لئے مہیا گئی
مٹی بھی ایک ڈمبیٹ تھی۔ روئے ہی جا رہی تھی اور ناصرو بے چاری
اسے چپ کراتے کراتے تنگ آگئی تھی کہیں وہ اس کا ناک صاف کرتی
اور کہیں اسے چپ کرانے کے لئے بجلی کے بلب جلاتی اور سبجائی کر نہ
جانے اسی پر مٹی چپ ہو جائے اور جب بلب جلتا اور پھر بجو جاتا تو
مٹی کچھ دیر کے لئے چپ ہو جاتی اور بلب کو دیکھتی رہتی۔ مگر جو یہی سلسلہ
بند ہوتا۔ پھر وہ اپنا باجا بجانا شروع کر دیتی۔
”نواب صاحب فیروز کرنے کا خیال ہے۔“ ناصرو رد ہانسی ہو کر

کہتی۔ ”کیوں مجھے پڑائے گی؟“
اور ناصرو کے ان سخت الفاظ کے ساتھ مٹی کا شور زیادہ تیز ہو جاتا۔ اور
اب مٹی گود میں موندنے لگی تھی کہ دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔
وہ جاگ گئی اور اس کے ساتھ ہی چپیں چپیں ہونے لگا۔ ہر سال
دروازہ کھولنا تو ضروری تھا۔ اور اسے کھولتا بھی کون؟ تو سکل گئے
ہوئے تھے۔

دروازہ کھٹکھٹانے والے چھوٹے بیٹیا تھے۔ انہوں نے ناصرو کی
چٹیا کپڑی۔ کیوں رہی ناصرو ہم تیرے نوکر ہیں۔ مگر صاحبہ کے جو اتنی دیر
سے دروازہ کھٹکھٹا رہے ہیں۔“

چھوٹے بیٹیا کا غصہ ۱۰ ڈگری پر تھا۔
”اوں اوں ناصرو بک پڑی تو میں کیا کرتی۔ یہ مٹی روئے جا رہی تھی۔“

کیوں تو مٹی کو مارتا ہوگا۔“ بیٹیا نے اس کی چوٹی کو جھٹکا دیا۔
”کون ہے؟“ باورچی خانے سے اُمی نے آواز دی۔

”میں ہوں اُمی“ بیٹیا بولے ”یہ ناصرو کی بچتی“

”کیا کیا ناصرو نے اُمی نے چلا کر کہا۔ ادھر آ کر سی ناصرو!“

بیٹیا نے اس کی چٹیا چھوڑ دی۔ اور ناصرو بے چاری اُمی کے حضور میں
حاضر ہو گئی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

”کیا ہے؟“ اُمی نے جو ہمیشہ آنکھیں پشیمانی پر رکھے رکھتی ہیں۔ پوچھا کیوں
سر پر اٹھا رکھا ہے۔ گھر کو؟

”جی“ وہ ناصرو سے بات نہ بن سکی۔ مٹی رو رہی ہے۔ جی۔“

”اُمی بیٹیا نے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔“ پڑی اونگھتی رہتی ہے اور کیوں
ری پڑی؟“ اُمی نے جوتے سے اس کی مرمت کر دی۔ خود اونگھ رہی ہے
اور مٹی پڑی رد رو کر ہلکان ہو رہی ہے۔“

”نہیں جی“ ناصرو نے کہا ”میں اونگھ کب رہی تھی۔ میں تو مٹی کو سلا رہی
تھی۔ کیوں بیٹے۔“ اُمی نے بیٹیا سے تصدیق چاہی۔

”ہاں، ہاں بیٹیا نے کہا“ اونگھ رہی تھی۔“

مگر یہ تو باہر سے آئے ہی۔ اور دروازہ میں نے خود کھولا ہے۔“

ناصرہ نے صفائی پیش کی۔

”جواب سوال کرتی ہے مٹی سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اور انہوں

نے ناصرو کی مرمت شروع کر دی۔“

بیٹھ گئی، کیوں کیا ہوا تجھے ناصرہ کی سچی۔ بھئیائے اس کی کمر پہ دھول جمانی
کچھ ہوا سوہنیں کیا ناصرہ نے کہا۔ جاؤ جا کر اپنا کام کر دو۔ بھیا کو جلال
ہو گیا۔ اور انہوں نے ناصرہ کو چلیا سے پکڑ لیا اور بولے ناگ مہیوں،
چڑھاتی ہے۔

”اوں اوں۔ ہوں۔۔۔ ناصرہ رونے لگی۔

بھئیائے گھبرا کر چلیا چھوڑ دی روتے ہوئے بچوں سے بھیا کو
ڈر لگتا تھا۔ اور پھر اسی سے بھی تو چھوڑ گیاں پڑنے کا خطرہ تھا۔ اگر
چھوڑ گیاں نہ پڑتیں، تو کم از کم کتا بھی پڑھتی پڑھتی۔ کیونکہ اسی ہمیشہ
منہ اس کے طور پر مسلسل پڑھاتی گا حکم صادر فرما کر قہقہے پڑھتا اور
وہ بھی کھیل کے وقت ایکساں انہیں تو کیا ہے؟ خدا خدا کر کے
تو اتوار کے علاوہ چھٹی ملی تھی۔ اور اگر وہ بھی پڑھ کر گزار دی جائے
تو لغت ہے۔ ایسی چھٹی پر۔ بھیا تو دعا مانگا کرتے تھے کہ خدا
ہر روز کسی نہ کسی ماسٹر کو توڑ کا دے۔ انہوں نے کہا۔

”اری ناصرہ تو توڑ رہا ہے۔“

”اور نہیں تو کیا ہنسوں“ ناصرہ نے کہا۔

”بھئیائے ہم نے تو مذاق کیا تھا۔“ بھیا نے کہا۔

”جی ہاں مذاق کیا تھا۔“ ناصرہ نے کہا۔ اور وہ جوامی سے مار کھائی

وہ بھی مذاق تھا۔ جھوٹ بول کر مار کھادی۔

”بھو۔۔۔ میں کیا پتہ تھا۔ وہ مار ہی گئی۔“ بھیا بولے ہم تو سمجھے تھے۔

”جی می۔“

”ناصرہ نے کہا جا۔“

”چل بیٹ یہاں سے اتنی نے غصے میں کہا۔

مٹی بدستور روئے جا رہی تھی۔ اور ناصرہ اسے چپ کرانے کے لئے بڑے
کمرے کی طرف چل دی۔ اور پھر کمزور پکس کا بس نہیں چلتا۔ خواہ مخواہ
مفت میں مار کھا کر غصے میں ناصرہ نے مٹی کے منہ پر زور سے طمانچہ مار دیا۔
اور خود بھی ہولے ہولے سکیاں لینے لگی۔

”اتنی کہہ رہی تھیں۔

”سکول سے صبح صبح کیوں آگئے بیٹے؟“

”اتنی۔ بھئیائے کہا۔ وہ اپنے بیڈ اسٹر میں نا۔“

”ہاں ہاں۔ انہوں نے یوں کہا۔ جیسے برسوں سے انہیں جانتی ہوں۔

”کیا ہوا انہیں خدا نواستہ؟ اتنی بھئیائے کہا۔ ان کے ہاں لڑکا ہوا ہے۔“

”اچھا۔ اتنی غرض ہو گئی۔“ لڑکا ہوا کب؟“

”کل۔“ بھیا نے کہا۔ اور انہوں نے سکول میں آج چھٹی کر دی۔

”تو جاؤ دوسرے کمرے میں جا کر سینی پڑھو ابھی سے کھیلتا شروع

کر دینا در نہ ابانا مارا من ہوں گے۔“

اور بھیا بغیر جواب دیئے بھاگ گئے

دوسرے کمرے میں ناصرہ تالین پر آہتی پالتی مارے مٹی کو سلاہی

تھی جو نہی بھیا کمرے میں داخل ہوئے سچوہ منہ دوسری طرف کر کے

اور بھیا سے آگے کوئی جواب نہ بن پڑا۔
 "اب جاؤ یہاں سے" ناصر نے کہا: "میں سوئے گا نہ ہے۔ اگر اٹھ گئی
 تھ پھر راک گا نا شروع کر دے گی۔"
 "اچھا" بھیا نے کہا: "اسے سنا لو۔ پھر کہیں گے۔"
 ناصر نے کہا:

"نہیں ہم تمہارے ساتھ نہیں کہیں گے۔ تم ہمارے راتے ہو" بھیا
 نے کوئی جواب نہ دیا۔ اپنی امیدیں کو ناصر ان سے ساتھ ضرور کیلے
 گی۔ اور وہ بھاگ کر سونے والے کمرے میں چلے گئے۔



مٹی بھی بڑی ڈھیٹ تھی۔ خدا خدا کر کے اور لوریاں سنا کر نا۔ ناصر
 نے اسے سنا ہی دیا۔ اور پھر کہیں کو کس کا جی نہیں جاتا۔ اسی باورچی
 خانے میں گوشت بھون رہی تھیں۔ اور ناصر کو پتہ تھا کہ وہ ایک
 آدھ گھنٹے سے پہلے باہر نہیں نکلیں گی۔ اور اگر انہیں پتہ چل گیا کہ مٹی
 سو رہی ہے۔ اور ناصر فارغ ہے۔ تو اس کی شامت آ جائے گی۔
 پھر تو اسے برتن دھونے پڑیں گے۔ یا فریق پر گھبرا کر پھر نا پڑے
 گا۔ نہ جانے ناصر کو ان دونوں کاموں سے کیوں نفرت تھی۔ ناصر
 نے بھیا کی تلاش شروع کر دی۔ مگر جیسا غائب تھے۔ ہوں ناصر

نے شہزادہ سے کہا۔

اور سیر صبا چڑھ کر اوپر چلی گئی۔ اسے معلوم تھا کہ جھیا کے پاس تنہائی کا دامن کھیل پتنگ اڑانا ہے۔ اور وہ اسی سے چوری چھت پر لوٹے ہوئے پتنگ اڑا رہے ہوں گے۔

جھیا واقعی اوپر موجود تھے۔ ناصرہ نے دبے پاؤں پیچھے سے جاکر جھپکایا۔ جھیا ڈر گئے۔ اور کھسیا فی ہنسی ہنسی کہہ بولے۔
"اوری تو تھی۔ تو کیا تم مجھے شیر لگیا ہے۔" ناصرہ نے جواب دیا۔
جھیا زور سے ہنسنے لگا اور کہا۔

"مجھے ہم چوبیا کو شیر سمجھنے والے نہیں۔ چوبیا تو تم خود ہو گئے گے۔ ہم تو شیر ہیں۔" ہم ٹکے میں۔ اسی لئے شیر تم لڑکی اس لئے چوبیا۔

جھیا نے جواب دیا۔

اور ناصرہ نے جھیا کو منہ چڑھا دیا۔ جھیا کے ہاتھ میں پتنگ کی ڈور رکھی۔ اور ناصرہ کو پتا تھا کہ جھیا ڈور چھوڑ کر اسے نہیں پکڑیں گے۔ مگر جھیا بھی کم نہ تھے۔ پہلے تو انہوں نے اسے پکڑنے کی کوشش کی۔ مگر جب ناصرہ جھیلی کی طرح جھسل گئی۔ تو انہوں نے کہا۔ بھڑو۔ اتنی سے شکایت لگاتا ہوں۔

"اور میں بھی بتا دوں گی۔ کہ تم نے پتنگ اڑایا ہے۔" ناصرہ نے کہا۔

جھیا خاموش ہو گئے۔ اگر ناصرہ اسی کو واقعی بتا دیتی۔ کہ جھیا نے پتنگ

اڑایا ہے۔ تو جھیا کی ابا بھی پٹائی کرتے۔ اور اتنی بھی چنانچہ جھیا نے مصالحت ہی میں بہتری خیال کی۔ انہوں نے کہا۔

"جھیا چھوڑ دو پتنگ لڑنے کو اچھے بچے لڑا نہیں کرتے۔ جھپک گاڑی چلاتے ہیں۔ یہی ناٹا چلو ناصرہ نے بھی رضا مندی کا اہلکار کیا۔

جھیا نے جلدی جلدی پتنگ اڑاتا رہا۔ ڈور لپیٹ کر اسے پرانے سامان کے نیچے چھپا دیا۔ اور بولے۔

"تم یہیں کھڑے ہیں گاڑی لے کر آتا ہوں۔"

جھیا کو بڑے بچانے ان کو ساتویں سالگرہ پر بیڑی سے چلنے والی گاڑی لاکر دی تھی۔ جس کے پیچھے پانچ ڈبے بھی لگے ہوئے تھے۔ یہ گاڑی لائن پر چلتی تھی جسے گولائی میں زمین پر بچھا دیا جاتا تھا۔ اور انجن میں دوسیل ڈالے جاتے تھے اور جب بین دہتا تھا۔ تو گاڑی خود بخود لائن پر دوڑنے لگتی تھی۔ جھیا یہ تھفہ پاکر بے حد خوش ہوئے تھے۔ اور دوسرے بچوں کو یہ تھفہ دکھا دکھا کر پوچھا کرتے تھے۔ چنانچہ ہم چچا سے ناراض ہو گئے اور چچا نے ہم سے وعدہ کیا تھا۔ کہ وہ ہماری سالگرہ پر ایسی ہی گاڑی لاکر دیگا۔ ناصرہ اور جھیا نے جھٹ فرنی پر لائن بچھا دی۔ اور گاڑی لاکر چلانے لگے۔

ایک طرف ناصرہ بیٹھ گئی اور دوسری طرف جھیا اور دونوں اپنی اپنی طرف سے گاڑی گزارنے لگے۔

کھیل میں دقت کا اندازہ کیسے ہوتا ہے اور یوں بے چاری

ناصرہ کو ایک عرصہ بعد کھیل کھیلنے کا موقع ملا تھا۔ وہ ایک گھنٹہ تک کھیلتے رہے۔ اور پھر ایک دم ناصرہ کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اتنی مٹی کو گود میں لئے کھڑی تھیں۔

بچوں کی چڑیل میں چلا چلا کر پاگل ہو گئی ہوں۔ اور مٹی رو رو کر بلکان ہو گئی ہے۔ اور تو بیاں بیٹھی ہے۔ امی نے غصے سے لال پیلیے ہو کر کہا۔

ناصرہ بچاری کیا جواب دیتی وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اور امی نے اس کی کمر پر مکوں کی بارش کر دی۔

بھیا بھی سہم گئے۔ انہوں نے جلدی جلدی گاڑی اور لائی سیمٹ اور سیرھیوں میں سے نیچے جھاگنے کے لئے راستہ تلاش کرنے لگے۔

انہیں امید تھی کہ امی ان کی بھی مرمت کریں گی۔ مگر امی نے کہا۔

اور سلیم کو بھی کھڑا رہی ہے۔ کبھوت اسے پڑھنے بھی دے گی کہاں سے ہماری قیمت میں لکھی تھی۔

پھر ناصرہ کی خوب خوب چائی ہوئی۔ وہ بے چاری چپ چاپ مار کھا رہی تھی۔ پھر امی خودی تھک کر بویں۔

اور وہ نیچے فرش کون صاف کرے گا۔ تیرا باپ۔

ناصرہ نے زور سے سسکی لی۔ جیسے باپ کے نام پر اسے انتہائی دکھ ہوا ہو۔

چل نیچے چل کر فرش صاف کر۔ امی نے چنا کر کہا۔

اور ناصرہ چپکے سے سیرھیاں اتر گئی۔ امی نے کہا۔

اور تم ادھر کیا کر رہے ہو۔

بھیا۔ بھیا گھبرا کر بولے۔ وہ ناصرہ کھیل رہی تھی۔ نا اس نے کہا۔ آکر تم بھی کھیلو اور۔۔۔۔۔

یہ گاڑی توڑ کر ہی دم لو گئے۔ امی نے کہا۔ ان کا غصہ ناصرہ کی پٹائی بکر کے کسی قدر کم ہو گیا تھا۔

اور بھیا چپکے سے بہا مان سیمٹ کر نیچے اتر گئے۔ اور پھر بھیا چپکے سے کتاب سامنے رکھ کر سلیٹ پر بلی اور چوہا کی شکل بنانے لگے۔ اور ناصرہ بے چاری کو فرش اداس کے بعد برقی صاف کرنے پر تھ

انہیں ایک اچھی سی ملازمت ملی گئی۔ ملازمت لینے کے بعد ان کے دور کے کچھ رشتے داروں نے ان پر سہرا باندھنا شروع کر دیں۔ اور جلد ہی ان کی شادی اپنے خاندان کی ایک یتیم لڑکی سے ہو گئی۔ ان کے دل مہنی خوشی گزرنے لگے۔ اور اللہ تعالیٰ نے جلد ہی ان کی خوشیوں میں اضافہ کر دیا۔ جبہ ان کے ہاں ایک گول مٹولی سے بچی نے بہم لیا۔ یہ نامرہ تھی۔ نامرہ کے ہاں اور باپ نے نامرہ کی پیدائش پر خوب خوشیاں منائیں۔ ان دونوں نے عزت اور یتیمی میں پرورش پائی تھی۔ اس لیے وہ اولاد کو ایک نعمت خیال کرتے تھے۔

نامرہ ہاں باپ کے ساتھ مہنی خوشی پرورش پاتی رہی اور ماں باپ اس کے لیے اچھے اچھے کھلونے اور کپڑے لاتے رہے اور اسی طرح وہ پانچ سال کی ہو گئی۔ اور پھر اسے سکول میں داخل کر دیا گیا۔ اور ابھی اسی نے پہلی جماعت کا امتحان دیا ہی تھا۔ کہ ان کے ابا کو، ایک دوست کی شادی کے سلسلے میں دوسرے شہر جانا پڑا۔ مگر کیسے معلوم تھا۔ کہ ان کا یہ سفر نامرہ کی زندگی کا روک بن جائے گا۔ جی بس میں وہ جا رہے تھے۔ اور اس میں جہاں دوسرے بہت سے لوگ زخمی اور ہلاک ہوئے۔ وہاں نامرہ کی امی بھی ہلاک ہو گئیں۔ اور اس کے ابا شدید زخمی ہو گئے۔ مگر نامرہ معجزانہ طور پر بچ گئی۔

نامرہ کے ابا ہمارے دور کے رشتہ دار جیسے ادا ابائے دست

نامرہ نے ایک کھاتے پیسے گھرانے میں آنکھ کھولی۔ مگر بد قسمتی سے سکھ اس کی قسمت میں نہ تھا۔

اس کے ابا اپنے ہاں باپ کے اکلوتے بیٹے تھے۔ وہ بتایا کرتے تھے۔ کہ جب نامرہ کے ابا پیدا ہوئے تو نامرہ کے دادا جان ایک حادثہ کا شکار ہو کر مر گئے۔ اور اس کے بعد اس کے دکھ میں نامرہ کی ماں بھی اللہ میاں کو پیاری ہو گئیں۔ پیاری نامرہ کے آبانے چوں تو ان کے دوسروں کے گھروں میں پرورش پائی اور بی اسے پاس کر لیا۔ خدا نے جلد ہی ان کے دل پییز دیئے اور

تھے۔ چنانچہ جونہی نامرہ کے آبا کے زحنی اور اس کی اُمّی کے مرنے کی خبر آتا کو ملی۔ دوا اُمّی کے ساتھ ہسپتال گئے۔

نامرہ کی اُمّی کے کفن و دفن کا انتظام خود آبانے کیا۔ نامرہ کے آبادی دن زندہ رہے تیسرے دن ان کی حالت خراب ہو گئی۔ تو آبا اور اُمّی ان کے سر ہانے موجود تھے۔ نامرہ چارپائی کی پٹی کو کپڑے رو رہی تھی۔ اس کے آبانے میرے آبا سے کہہ دیا جہاں شاید میں زندہ نہ رہوں مگر اس کی بچی کا میرے بعد کیا بنے گا۔ اگر آپ مجھ سے یہ وعدہ کریں کہ میرے بعد اس بچی کو اپنی بچی سمجھ کر رکھیں گے۔ تو میرا مرنا آسان ہو جائے گا۔ آپ وعدہ کریں۔

ایسی باتیں نہ کریں۔ آبانے کہا: نامرہ میری بچی ہے۔ اگر خدا نہ کرے۔ آپ کو کچھ ہو گیا۔ تو میں اسے اپنی بچیوں سے زیادہ عزیز رکھوں گا۔

نامرہ کے آبانے ایک لمبا اور پر سکون سالن لیا اور بولے۔ باب دادا کی ایک ہی نشانی مکان ہے۔ اسنوں میں اپنی بچی کو اس سے زیادہ کچھ نہیں دے سکتا۔ بس یہی دے رہا ہوں۔ بھائی جان اسے کرائے پر چڑھا دیں۔ اس کا دوسو روپے تک کرایہ مل سکے گا۔ اور یہ رقم میری بچی کی پرورش اور تعلیم کے لئے محفوظ رہے گی۔ اور مگر کامالہ بھائی تو ہے۔ بہر حال بھائی نامرہ آپ ہی کی بچی ہے۔ جیسے مناسب سمجھیں کر لیجیے گا۔ مگر میری بچی کو۔

نہیں بھائی صاحب میرے آبانے جواب دیا۔ آپ زندہ رہیں گے۔ اور خود اپنی بچی کی پرورش کریں گے۔

میرے آبانے جواب دیا۔
مگر نامرہ کے آبا کا وقت پورا ہو چکا تھا۔
اور وہ مر گئے۔

نامرہ اس بھری دنیا میں اکیلی رہ گئی۔ کہنے کو تو اس کے اور بھی بہت سے خیر خواہ تھے۔ مگر کون کسی کا ہوتا؟ اور یہ دن نامرہ کے لئے مصیبتوں کا دن ثابت ہوا۔

پھر نامرہ ہمارے گھر آئی۔ جس دن نامرہ ہمارے گھر آئی بھلا خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ مجھے ایک بہن مل گئی اچھی سی گول مٹول اور خوبصورت سی اور چھوٹے مہیا کو مارنے کے لئے ایک اور شکار ہمارے آگیا۔ میں نے اپنی ڈھیر ساری کڑیاں نامرہ کو دکھائیں۔ اور اس سے آدھی آدھی بانٹ لیں۔ مگر نامرہ خاموش خاموش اور اداس اداس ہی رہی۔ دن رات میں وہ کئی کئی بار رو پڑتی اور امی بڑے پیار سے اسے چپ کراتیں۔ اکثر رات کے وقت وہ اٹھ کر بیٹھی اور روزنامہ شروع کر دیتی اس وقت اُمّی اور آبا اسے تسلی دیتے اور اسے لٹکا پھر سکا دیتے اسے اپنی اُمّی اور آبا یاد آتے رہتے۔ یہ ایک فطری بات تھی۔

مگر جلد ہی نامرہ کے برے دن شروع ہو گئے۔

اسے گھر میں آئے ہوئے ایک ہفتہ ہی ہوا تھا کہ گھر میں کچھ عجیب
واقعات ہوئے۔

سب سے پہلے ادیر والے کمرے کا شہرہ ٹوٹ گیا۔ اور اتنی
کی ٹانگ اس سے زخمی ہو گئی۔ وہ تو خدا کا شکر ہوا کہ میں بال بال بچ
گئی۔ پھر بڑے بھائی جان ویم کے منکڑ کا اکسیڈنٹ ہو گیا۔ اور
وہ بڑی طرح زخمی ہوا اور ہسپتال میں پناہ لیا۔

سیر اداقتہ ابا جان کی جیب کٹنے سے ہوا۔ جب ان کی پوری
تنخواہ کوئی جیب کترانے اڑا۔

چوتھا یہ حادثہ ہوا کہ چھوٹے بیٹا کو منوینر ہو گیا۔ اور حد تو
یہ تھی کہ مٹی اور میں بھی محفوظ نہ رہے۔

میں کنوپی میں گر گئی۔ اور بڑی مشکل سے مجھے اسی میں سے نکالا
گیا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ کنواں زیادہ گہرا نہ تھا۔ اور میری زندگی
محفوظ رہی۔

پھر مٹی کو بھی بھجوانے لیا۔

سیر سارا گھر ہسپتال بن گیا۔ اتنی بے چاری خود ٹانگ پر چوٹ
لگا کر بیٹھتی تھی۔ ابا نے دفتر سے چھٹیوں لئے لیں۔ اور گھر کا سارا کام
کارج کرنے لگے۔ ایک دن اسی کے ممبر کی پیارا لبریر ہو گیا۔

”یہ منحوس ہے۔ منحوس نامی اور بیٹا ایک دم بولے۔

”یہ منحوس ہے مٹی نے کہا۔ جب سے آئی ہے گھر میں آرام اور کنواں

ختم ہو گیا ہے۔ سارا گھر بیمار ہو کر پڑ گیا ہے۔ تنخواہ بھی گم ہو گئی۔ اور مصیبت
الگ۔ اور سے مکان کی چھت گر گئی۔ وہ تو نہ جانے کیا نیک اعمال کا دم
آگئے۔ کہ میں بچ گئی۔ ورنہ میں نیچے آجاتی۔“

”ناظرہ آگئی تھی۔ اس نے سہی ہوئی آواز میں کہا۔

”کیا بات ہے؟ ابا جان؟“

”خبردار جوان کو ابا جان کہاں باپ کو کھا کر اب میں کھانے
کا ارادہ ہے۔“ بیگم ابا بولے۔ ”آہستہ بات کرو۔ تم یتیم بچہ پر ظلم
کر رہی ہو۔“ اور اتنی نے اپنا مخصوص ہتھیار رونا شروع کر دیا۔
ابا گھرا گئے۔ اور ہمیشہ کی طرح انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔
اتنی نے کہا۔

”یہ لڑکی اسی گھر میں نہیں رہے گی؟“

”تو پھر کہاں تم جائے گی؟“ بھائی جان نے دخل دیا۔

”جہنم میں“ اتنی چنا کر بولیں۔ ”مہرنے یتیم خانہ کھول رکھا ہے؟“

”جہاں دل چاہے چلی جائے۔“

”مگر یہ ظلم ہے۔“ بھائی جان بولے۔ ”انہوں نے ابا کو مخاطب
کر کے کہا۔ آپ نے اس کے والد سے کیا وعدہ کیا تھا؟“

”مگر ابا جان نہ جانے کیا سوچ رہے تھے؟“

اتنی نے پھر کہا۔

”میں اپنا گھر اس کے لئے تیار کرنے کو تیار نہیں۔“

مگر یہ یہاں سے نہیں جائے گی۔ بھائی جان نے کہا۔
 "تم کیا کر لو گے۔ اس کا دیکھتے ہو۔ یہ یہاں کیسے رہے گی۔ بھائی
 جان نے کہا۔ اور اٹھ کر سہمی ہوئی ناصرو کا ہاتھ حتمام لیا۔ مگر
 بھائی جان بھی غصے میں آگئے تھے۔ ہمارے بھائی جان ایسے
 موقعوں پر جذباتی ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے کہا۔

تو ٹھیک ہے۔ میں بھی اس گھر سے چلا جاؤں گا۔
 "دوسیم عقل کرد" آبا جان نے دخل دیا۔ تم اپنی ماں سے گفتگو کر
 رہے ہو۔

"مگر آبا جان میں اس نہتی سی جان پر ظلم نہیں ہونے دوں گا۔"
 بھائی جان نے کہا۔

اور ناصرو کا بازو پکڑ کر دوسرے کمرے میں لے گئے۔ اس دن
 کے بعد ناصرو کا بڑا درد شروع ہو گیا۔

وہ اسکول سے اٹھالی گئی۔ اور گھر کا کام کا بج کرنے لگی تھی۔ نہتی سی
 جان بالکل گڑبایا سی چنڈی دونوں میں بالکل کھلا کر رہ گئی۔ اُمی اس
 سے برتن صاف کرواتی جھاڑوں دلوایتیں رفرش صاف کرواتی
 اور سارا دن منی کو گود میں دیئے رہتی۔ "بیجاری کا جینا حرام ہو گیا
 وہ خاموش خاموش سارا دن گھر کا کام کرتی رہی۔ روتی رہتی وہ غمناک
 اور اچھی اچھی باتیں کرنا گویا بھول گئی تھی۔ مگر آبا جان اور بھائی جان
 اس سے بڑا پیار کرتے تھے وہ ہر روز اس کے لئے اچھی اچھی چیزیں

لاتے اور اپنے سامنے اسے کھلاتے اس وقت اُمی خون کے گھونٹ
 پی کر رہ جاتی۔ بڑ جانے اُمی کو کیوں اس سے اتنا بُر تھا؟ اُمی اسے
 منحوس خیلا کرتی تھیں۔ اور اس کا وجود بھی ان کے لئے قابل برداشت
 نہ تھا۔ مگر وہ مجبور نہیں اگر وہ اسے گھر سے نکالنے کی دھمکی دیتی تو بھائی
 جان بھی اس کے ساتھ جانے کی دھمکی دیتے۔ آبا جان اس کے لئے
 کھلونے لاتے۔ جنہیں آبا جان کے جانے کے بعد ہم اس سے چھین لیتے
 اور وہ بے چاری آنکھوں میں آنسو جھر کر خاموش رہتی۔ مجھے اس
 وقت ناصرو پر بڑا رحم آتا۔ بھائی جان اسے اپنے کمرے میں لے
 جاتے۔ اور اپنے پاس بٹھا کر بڑے پیار سے کتابیں پڑھاتے انہیں
 معلوم تھا۔ کہ اُمی ناصرو سے کیا سلوک کرتی ہیں۔ مگر وہ مجبور تھے۔
 وہ اُمی کا مقابلہ کیسے کر سکتے تھے؟

چڑھتی میں رہی۔ جب اسے وقت ملا۔ وہ جلدی سے اپنی کتابیں سمبھال لیتی اور پڑھنا شروع کر دیتی۔ وہ ہم سب بچوں سے زیادہ ذہین تھی۔ اور بہت جلد اس نے ہم سے زیادہ کتابیں پڑھ لیں۔ اور بھائی جان نے اسے اگلی جامعہ کی کتابیں لادیں۔

چھوٹے بھیا کو نہ جانے بے بیماری ناصرہ کو ستانے میں کیا مزہ آتا تھا۔ مگر وہ جس قدر ناصرہ کو ستاتے اتنا ہی اسے پیار کرتے تھے۔ وہ نول ہی کمرہ تھے۔ اس لئے مجھ سے چھوٹے بھیا کی عمر ایک سال کم تھی۔ اور ناصرہ کوئی ماں چھ ماہ چھوٹے بھیا سے چھوٹی ہو گئی۔

شاید چھوٹے بھیا اور ناصرہ میں مستقل تکرارے اور رائے کی وجہ ہو کہ اسی ہمیشہ چھوٹے بھیا کے مقابلے میں ناصرہ کی چٹائی کر دیتی تھیں۔ اسی تو یوں ہو گیا۔ ناصرہ کی چٹائی کرنے پر تیار نہ تھیں۔ چوٹی کسی نے ناصرہ کی شکایت کی۔ اسی نے دو چار دھول بے جا دی۔ کمر پر جھاڑ دیتے۔ جب تک ابا اور بھائی جان گھر پر رہتے ناصرہ کی عید نہ ہوتی۔ اسی دن سے کوئی کام نہ کر دیتی اور نہ ہی اسے مار پڑتی۔ کیونکہ ناصرہ کو مارنے پر ابا اور بھائی جان سخت ناراض ہوتے تھے۔۔۔ اور بعض اوقات تو اسی سے بول چال بھی نہ ہو جاتی تھی۔۔۔ اسی وجہ سے اسی نے ان لوگوں کی موجودگی میں ناصرہ کو مارنے سے گویا توبہ کر لی تھی۔

چھوٹے بھیا بھی اکثر ناصرہ کی چٹائی نہ کر سکتا تھا۔ پشیمان ہوا کرتے تھے۔ اور بہت جلد ناصرہ سے معاف مانگ لیتے۔ مگر ایسے ہی

وقت گذرتا رہا۔ اور ناصرہ اس گھر میں ایک ملازم کی حیثیت سے رہتی رہی۔ بچاری میلے کپڑوں میں لپیٹ کر وقت بے کام کر وہ کام کر کے آوازیں سنتی۔ اور بلا چوں و چرا سب کے احکام مانع تو رازدا می بات پر اپنی اس کی ٹپائی نہ کر دیتی۔ مگر بھائی جان کے روئے ہی فرق نہ آیا۔ انہوں نے ناصرہ کو اپنی بیٹی بنا لیا تھا۔ وہ جب گھر سے ناصرہ کو اچھے اچھے پہنا تے اچھی اچھی چیزیں اور کھلونے لاکر دیتے۔ اور اسٹول کی کتابیں پڑھاتے۔

اسی طرح ناصرہ براہ راست نہیں تو بھائی جان کی مدد سے

اندر از ہی حادی اگتے جس سے انہی کا مسخ ہوا کرتا تھا۔

پھر انہی کچھ سے زیادہ سنا صرف کے ساتھ
کھیلنے میں منہ آتا ہے۔ اس کی وجہ تھی۔ کہ وہ منہ پر ہاتھ نہ اٹھا سکتے تھے۔
ایک وجہ تو یہ بھی تھی، کہ میں ان سے بڑی تھی۔ اور دوسری وجہ ای کی طرف تھی
تھی، بھیا کے مقابلے میں ہمیشہ میری بات زیادہ مافی باقی تھی۔ اور میری
شکایت پر بھیا کی پٹائی ہر جا تار کی تھی۔

اُسے بڑی بہن پر ہاتھ اٹھا آئے۔ انہی کسی اور پھر بھیا
کا گریہ دوبارہ دھول پڑ جائے۔
اور نہ صرف اہل بھائی جان اسے اپنی بیٹی نہ بنا دیتے۔ تو ناصرف چاروں
اب تک مر گئی ہوتی۔

گر میوں کے دلوں میں جب جیسا کہ میں چار پان بچھا
کرنا ضرور کو اپنے ساتھ بیٹا یا اور سبق دینے لگے۔ تو اباجان ان کو
دیکھ کر سے دیکھتے پھر ان کے چہرے بھیا سے کہا۔
”سلیم تم بھی کاتین یکے میرے پاس آؤ۔ دیکھو تو سبق
یا دست یا نہیں۔“

اباجان یہ تو میرے بڑے کمرے میں بیٹھا پڑھ رہا ہوں :

بھیا نے جواب دیا، ”اے بیٹی تو یہ دیکھنے لگا ہوں :
”تو کیا آؤں۔ مگر انہیں گھٹے۔ ابانے چیرائی سے پوچھا۔ انہی سب
کچھ ان ہی تھیں۔ بولیں۔

”ابو داؤد آج یہ بہت جلدی آگیا تھا۔ کھانا تھا۔ بیڑا سڑک کے گھر
مڑا کہ جواب ہے۔ اور بچی ہو گئی :“

”جو جم جھجھکاں۔“ اباجان ہوا تھا۔ سلیم بھیا بھرا گئے
”آپ جا کر انہیں مبارکباد دے آئیے۔ امی نے کہا۔ میں تو جانے سے رہی
یہ گھر کے کام کا بچہ بیچا ہی نہیں چھوڑتے۔ آپ ذرا چلے جائیے۔
بچے کا استاد ہے خوش ہو جائے گا۔ یہ پاس ہی تو گھر ہے۔“
ای بولے جاری تھیں۔

اور ابانے اٹھ کر شیر و افروہی اور باہر نکل گئے۔ تھوڑے بھیا
کا بڑا حال تھا۔ ان کی پیشانی پر گھبراہٹ سے پسینہ لگتا تھا۔
”کیا بات ہے بیٹے امی نے کہا۔ تم کچھ گھبرائے ہوئے سے ہو
نہیں تو اتنی بھیا بولے نہیں تو میں۔ اور امی ان کا خراک مینے
میں مصروف رہی۔
”کیا بات ہے؟“

میں نے بھیا کے کان میں کہا : ”مجھے تو بتا دو نا۔“

”چڑھیل : بھیا نے زور سے کہا۔ ”جیل سے پڑے :“

اور میں دانست دکھا کر دلوں سے ہٹ گئی۔ مگر کچھ شک خوف رہا
کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔“

ماسٹر جی کا گھر گلی کی گز پر تھا۔ ابانے جا کر ادا نہ دی۔

ماسٹر جی خوش قسمت تھی سے گھر پر موجود تھے بولے۔

”آئیے! شیخ صاحب کیسے آنا ہوا۔ آج؟“
 ”مبارک ہو! ماسٹر جی! ابانے منکر کر کہا۔ خدا ایک شریف
 قسمت والا کرے۔ بچہ؟“
 ”کون؟“ ماسٹر جی گھبرا گئے۔
 ”اجی۔ تو مولود صاحبزادے۔“ اباجی نے کہا۔
 ”مگر شیخ جی! ماسٹر جی سب کچھ سمجھ کر بولے آپ سے کسی نہ
 یونہی کہہ دیا ہے۔
 کاش خدا واقعی مجھے کوئی اولاد دے۔“

ماسٹر جی بے چارے بے اولاد تھے۔
 ”مگر سلیم تو آج صبح ہی سکول سے آگیا تھا۔ اسی نے بتایا کہ ہمارے
 سید! سڑک کے ہاں لڑکا ہوا ہے اور سکول میں چھٹی ہو گئی۔“
 ماسٹر جی نے جب شیخ صاحب مگر اتنی سی بات پر سکول میں گیت
 چڑھ کر رہ گئے۔ اور آج تو سلیم خود ہی سکول نہیں آیا بلکہ
 تو صاحب دستور کھلا اور بند ہوا ہے۔“
 ”ماسٹر صاحب نے بتایا۔“

”حافظ! کیسی ماسٹر صاحب! اباجی نے کہا۔ میں تو بچے
 سے بات سن کر خوش ہوا تھا۔ اور مبارکباد دینے کی غرض
 سے چلا آیا۔“
 ”کوئی بات نہیں! ماسٹر جی نے کہا۔ آپ کیسے۔ تشریف لے

رکھیے۔ اندر آ جلیے نا۔ نہیں نہیں! ماسٹر جی پھر کہیں سہنی! اباجی نے
 اٹھ کھڑا ہوا اور واپس گھر لوٹ آئے۔

”مچھوٹے بھیا کتا بی نکالے مزے سے پڑھ رہے تھے
 مگر ان کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ کیا ہونے والا ہے
 اتنے میں اباجی گھر میں داخل ہوئے۔ اور لمبدا آواز میں کہا۔
 ”وسیم کی ماں ادھر آؤ۔“

”کیا ہے؟“ امی نے کہا۔ اور جلدی سے اباجی کے پاس آگئیں اور
 بولیں خیر تو ہے۔ کیا ہے۔ ماسٹر جی کا بچہ۔ آپ اتنی جلدی آج
 کئے۔ یا۔؟“

”خود ہی بولو گی۔ یاد دہروں کو بھی کچھ کہنے دو گی۔“ ابانے سختی سے
 سے کہا۔ ”میری بھی تو سنو۔ اچھا خاموش ہو گئیں اور اباجی طرف
 دیکھتی رہیں۔“

”ماسٹر جی کے ہاں لڑکا وغیرہ کوئی نہیں ہوا۔“ اباجی نے بکھرے
 لاڈ سے صاحبزادے آج سکول سے بھاگ آئے ہیں۔“
 ”نہیں نہیں۔“ امی نے کہا۔

”میرا بچہ ایسا نہیں ہے۔؟“
 ”ہاں ہاں وہ تو پیغمبر ہے۔“ ابانے کہا۔ وہ کہاں سکول سے آسکتا
 ہے۔ سلیم ادھر آؤ۔ سلیم نے کتا میں رکھ دیں۔ اور اباجی کے پاس
 آگیا۔ اسی کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ آج ماسٹر جی کے ہاں لڑکا ہوا

تھا۔ اور تھیں سکول سے چلائی گئی۔
ابا جانے لگا۔

جس وقت راستے پر ایک لڑکے نے کہہ دیا تھا۔ اور میں والہا
آگیا میں سچ کہہ رہا ہوں۔ ابا جان! جیتا ہے۔
ایک زوردار ٹھانچہ سلیم کے گال پر پڑا۔ اور اسی تڑپ
کو بولیں بچے کو مار ہی دو گے جان سے میں۔۔۔۔۔

اور باتے ان کی بات چوری کرنے مزدی اور کیڑی کر پوسے۔
ختم خاموش رہو۔ تم ہی نے انہیں سر پر چیرھا رکھا ہے۔ کیوں
برغوردار کیا بات ہے۔ سچ مجھ بتا دو۔

اُمی بھگی بلی بن کر خاموش ہو گئیں۔ اور باتے دوچھا
ٹھانچہ سلیم کو دیکھ دیتے۔ اور سلیم نے ماری بات بتا دی۔ کہ اس
نے سکول کا کام نہیں کیا تھا۔ اور ڈر کے مارے سکول نہیں گیا۔
اور یہ بھانا بنا یا کہ۔

پھر ابا اور اُمی نے سلیم کی بڑی چٹائی کی۔ میں نے نامہ کو
طرف دیکھا۔ وہ سہمی ہوئی سلیم کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میرا خیال
تھا کہ وہ ضرور خوش ہو گیا۔

مگر اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔
پھر جانی جانے جہاں سلیم کی خبر لی اور نامہ کے کہنے پر اسے چھوڑ
دیا۔ بہر حال اس تمام سلیم بھیا کی خوب پٹائی ہوئی۔ اور اُمی نے

سزا کے طور پر انہی رات کا کھانا بھی نہ کیا۔

جب سے رات زیادہ ہو گئی اور سب لڑکے تو نامہ اپنے بستر پر
سے اٹھیں۔ اس نے اپنے سرانے کے نیچے اخبار میں پٹی چڑی کوئی
چیر نکال کر اسے پی پکڑی۔ اور سلیم کے بچے کی طرف بڑھی۔
میں اسے تک جا کر رہی تھی۔ اور سب بچے دیکھ رہے تھے
اس نے چیرٹے جیسا کہ سرانے جا کر ان کو دکھایا۔ بھیا اُمی بھی
روستے ہوئے سو رہے تھے۔ گھبرا کر اٹھ گئیں۔

کیا ہے؟ انہوں نے پوچھا۔ اور گھبراہٹ میں کہی۔
"مٹی۔ نامہ نے منہ پر انگلی رکھ کر کہا اور آہستہ سے بستر سے اٹھ
کر آنے کا اشارہ کیا۔
بھیا اٹھ گئے۔

باقی لمب میٹھ میٹھ سو رہے تھے۔ وہ نامہ کے ماتر جا کر
برآمدے کے کونے میں بیٹھ گئے۔

نامہ نہ نہ کاغذ کھوئی نرینیا کے سامنے بچپا دیا۔ میں نہ گردن
گھما کر دیکھا۔

اس میں کھانا تھا۔ جیسا کہ تھا۔
"یہ تم کہاں سے لے آئیں نامہ؟"
وہ نامہ کو پیار سے نامہ ہی کہا کرتے تھے۔
میں نے اپنا کھانا نہیں کھایا تھا۔ نامہ نے کہا۔ اور اپنے منہ میں

چھپا کر رکھ دیا تھا۔

• مگر کیوں؟ چھپانے کہا۔

• تمہیں امی نے کھانا جو تین دیا تھا۔ ناصرو نے کہا۔ مگر ایک بات
کہوں۔ بڑا نرمنا کیا بات ہے؟ چھپانے ایک بڑا اہم
منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

• سکول سے مت بھاگا کرو۔ ناصرو نے کہا۔ پھر اس

کی آنکھ میں آنسو آگئے۔ اور وہ بولی۔

• اگر میں سکول جایا کروں تو اللہ کی قسم کبھی بھی سکول سے نہ
بھاگوں۔ میرا تو دل اتنا چاہتا ہے سکول جانے کو۔

• تو جایا کرنا۔ چھپانے کہا۔

• امی نہیں جانے دیتی۔ اس نے بے بسی سے جواب دیا۔ اچانکہ
چھپا کو کچھ خیال آگیا وہ بولے۔

• مگر ناصرو تم نے بھی کھانا نہیں کھایا ہوگا۔

• تم کھاؤ۔ صبح کھاؤ گی۔ وہ بولی۔

• نہیں، سلیم چھپانے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

• تم بھی کھاؤ۔

• ورنہ میں نہیں کھاؤں گا۔

• اچھا کھاؤ گی۔ ناصرو نے کہا۔ اور دونوں کھانے لگے۔ مگر میں نے

محسوس کیا ناصرو ہمیں یونہی دیکھا دے کو کھاری سب۔ ورنہ

وہ سلیم بھیا کو اپنے حصے کا کھانا کھلا رہی تھی۔

• اور میں شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ ایک میں ہوں

جو سلیم بھیا کی سگی بہن ہوں۔ مجھے تو خیال نہ آیا اور یہ ایک

ناصرہ ہے۔ جو سلیم بھیا کی سگی بہن نہیں ہے۔ امی نے اپنے

حصے کا کھانا انہیں کھلا دیا۔ میں اگر چاہتی تو امی سے کہہ کر سلیم

بھیا کو.....

مگر میں جلدی چونک گئی۔ امی جاگ گئی تھیں۔ اور انہوں

نے ناصرو اور سلیم کو بہادر سے میں بچے دیکھ لیا تھا۔ ان کا

غصہ آخری درجہ پر آگیا۔ اور میں نے سہم کر آنکھیں بند کر لیں۔ اتنی

دوبی سے چلائی۔

• حرام خور، تیری یہ سمت خود بھی چوری کرتی ہے۔

• میرے بیٹے کو بھی چوری سکھاتی ہے۔ اور وہ بھی رات

کے اندھیرے میں۔

پھر وہ زور زور سے چلانے لگیں۔

• ابا اور بھیا بھی جاگ گئے۔

• کیا ہوا؟ کیا ہوا؟۔ بہن نے کہا۔

• امی سلیم بھیا اور ناصرو کے سر پر پہنچ گئی تھی۔ اور

انہوں نے بے تحاشہ ان کی ٹپائی شروع کر دی۔ ناصرو

بے چاری سسکیاں لینے لگی۔ ابا نے جلدی سے اٹھ کر اسے

جسٹریا۔ بھیا بھیا قریب پہنچ گئے۔ اور میرانی سے سب کچھ دیکھنے لگے۔

”بھیا کیا حرام؟ وہ بوسہ

”اس حرام خود سے پوچھو اور میں نے ناصروہ کے ایک اور اصول جنہ دی۔ دن کا مراد بھر آئی تھو کہ وہ آبا اور جیہ کی موجودگی پہی ناصروہ کو اترتیں۔ اس نے رات کے اندر میرے میں کھانا چسٹہ لیا۔ اور سلیم کے ساتھ مل کر کھا رہی تھی نہ جانے اس کا پیٹ کیوں نہیں بھرتا۔ پیٹ بے یا کھانا نہ کر آج بکے اسے پیٹ بھر کر کھانا کیوں نہیں دیتے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر میں نے چوری کی دیکھو۔ ناصروہ جسے بھیا کے کھانا سے ناصروہ غامق تھی۔ اور بھیا کے لیے یہ کھانا سب کچھ بھیا کے لیے کھانے کے لیے تھے۔ مجھے سلیم بھیا پر بھیا وغیرہ آیا۔ بھیا بھی کوئی بات نہ کہہ سکتی تھی۔ ان ہی کے لیے یہ سب کچھ کھا۔ اور وہی چھپ چھپ۔ خبر سے زیادہ دیر نہیں ہو سکتا۔

تم بتانی کیوں نہیں کہہ سکتے ناصروہ سے پوچھا۔

”میں بتانی مولا نے اچانک اس کو کہا۔

”تو کیا بتائے گی؟

”اچانک کہا۔

”تو تو سمجھ رہی تھی۔ ابھی تو شور مچا کر جا گئی ہے۔ چل اپنے بس تریہ میں جاگ رہی تھی۔ اور سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ میں بتانی ہوں۔“

”لوں ان بتاؤ رضیہ بھائی جان نے اس کے بڑھ کو کہا۔

آبا جان بھی قریب آگئے۔

اور میں نے سارا واقعہ آبا جان اور بھائی جان کو بتا دیا۔

”یہ جھوٹ بول رہی ہے۔“ اسی جان بھائی متاثر ہونے کے اٹھا

مجھے کوڑاٹنے لگیں۔ کیوں سلیم بیٹے جھوٹ بے ناس؟

نہیں اسی جان سلیم نے تلواریں نیچی کر کے کہا۔ رضیہ اچھی

کھشک کہتی ہیں۔ اسل واقف ہی ہے۔

اور امی جلدی سے سلیم کا بازو پکڑ کر اپنے بستر کی جانب

چلا گئیں۔ کیونکہ منی جاگ گئی تھی۔ اور رونے لگی تھی۔ اسی کو

اس سے بہتر بہانہ اور کوئی مل سکتا تھا۔

آبا جان نے ناصروہ کو گود میں اٹھا لیا۔ اور پیار کرنے لگے۔

انہیں ناصروہ کے اسی خلوص اور محصوم سی فرتہ رانی پر بڑا

پیار آیا بھائی جان کہہ رہے تھے۔

”دیکھا آبا جان کتنی اچھی بچی ہے۔“

”بیشک آبا جان نے کہا۔ تیری بیٹی بہت اچھی بچی ہے۔“

پھر انہوں نے مجھ سے کہا۔ رضیہ بیٹے جاو۔ ناصروہ کے لئے کھانا لائو۔

”جی میں۔“ ناصرہ نے کہا۔ میں نہیں کھاؤں گی۔
 کیوں؟ بیٹھی جانے کہا۔ تم نے تو کھانا نہیں کھایا۔“
 ”اسی ماریں گی۔“ ناصرہ نے کہا۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔
 ”نہیں ماریں گی۔“ اباجان نے کہا۔

اسی اپنے بستر پر پڑی بڑبڑا رہی تھیں۔ مٹی اسی کے آنے سے
 چپ ہو گئی تھی۔ اور سلیم بیٹا اپنے بستر پر لیٹے سب کچھ
 دیکھ رہے تھے۔ اور دل ہی دل میں ہم سب کو برا بھلا کہہ
 رہے تھے۔



میں ناصرہ کے لئے کھانا لے آئی۔ بیٹھی جانے اپنے
 ہاتھ سے اس کے منہ میں لقمہ ڈالا۔ ناصرہ نے کہا۔
 ”اور سلیم بھی تو بھوکا ہے۔ اس نے بھی چند ہی لقمے کھائے۔“
 ”نہ۔ ات بھو بلا میں نا۔“
 مچھیا نے اسی کی خواہش رد کرنا نہ سیکھا ہی کب تھا۔ انہوں
 نے فوراً سلیم کو بلایا۔
 اور دونوں نے رات کے وقت کھانا کھایا اور سو گئے۔

وقت گذرتے دیر نہیں لگتی۔ وقت گذرتا گیا۔ ہم اسکول میں پڑھتے
سب اور ناصرہ بھائی جان سے پڑھتی رہی انفرادی توجہ نے اسے
جستہ بازی سے جانے کا موقع دیا۔ وہ ہم سے دو جماعت آگے کی
مقام میں پڑھنے لگی۔ بھائی بہان اسی کی کامیابی پر بہت خوش
ہوئے۔ مگر یہاں سے اسی کی لڑائی اور اسی کے اس پر مظالم
ہستہ رہے۔

پھر سر دیو، میں جب بھیجا جو ایک منہ سرم ہی افسر ہیں۔
جب کاروباری رورے پر گئے۔ تو امی نے بدعات تیار کی
کہ دیو زناہری بیماری کو گرم کپڑے نہ پہنے اور صحت سے
پانی سے اسے برقی کپڑے اور خوش صاف کرنا پڑے جس
کافیہ بینک کا وہ برادر ہو گئے۔ ایک دن کی وجہ سے ابو کو مسلم
نہ ہو سکا۔ اور جب وہ سرے دن ابانے دفتر سے آکر ناصرہ
کو دھوپ میں لیٹنے دیکھا۔ تو اس کے قریب آئے اور پوچھا
"کیا بات ہے۔ بیٹے؟"

"جی کچھ نہیں۔" ناصرہ نے کہا اور اٹھنے کی کوشش کی۔
ابا نے اسی کا جسم جھپٹا تو حیران رہ گئے۔ اسی کا جسم آگ
کی طرح جل رہا تھا۔ اسے تو ہنسا رہا تھا۔ وہیم کی مان
ابانے باہر آواز سے کہا: "اسے کوئی دوا بھی دی ہے؟"
اتنی نے سنا ان سنی کر دیا۔ ابانے پھر چلا کر کہا:

وہیم کی دوا۔

"جی۔ امی نے باورچی خانے سے جراب دیا۔

"ڈرا اور صاف کرنا دے گا۔"

"امی آگئیں۔ آجے کہا۔"

"ناصرہ! میں کوئی بڑا بڑا سچہ اسے کوئی دوا بھی دی۔"

"بڑا امیر دیکھا ہے دینی ہوں۔"

مگر اسے تیز بنا رہے ابانے کہا۔

اور پھر اسے باز سے بکڑ کر اٹھایا اور ڈاکڑ کے پاس لے

جانے گئے۔ انہوں نے کہا "خیر بیٹے ایک نئی شہتی اور نئے دور

"شاید ڈاکڑ سچر دے گا۔"

تو کیا اسے اب ڈاکڑ کے پاس لے جایا جائے گا۔ اتنا کہ

پرچہ ان کے لیے ہی طے تھا۔

"اور کیا اسے گھر میں پڑا رہے دوں اور مر جانے دوں؟"

ابانے غصے سے کہا: "بھئی امی نے ابا کا موڈ دیکھ کر اپنا موڈ

بدل دیا میرا مطلب تھا ڈاکڑ کو بتا دیا مونا۔ کہ بچی کو بخیر

ہے۔ دوا دے دے گا۔"

"خیر خواہی۔" ابانے کہا۔

شہتی بیکر باہر چلے گئے۔

ڈاکڑ نے بیمار کا منہ اور کڑوی دوا دے دی۔ اسی نے بیمار

یہ ملیر یا مراد لیا اور پانے آتے ہی کڑوی دوا کی ایک
خوراک اسے دے دی اور باقی دوا میز پر رکھ دی۔
چھوٹے بھائی کو پل بھر بھی چین کہاں۔ انہوں نے گیند
کھیلنے سے زور سے جو گیند ماری۔ تو دوا کی شیشی الٹ
گئی۔ بھیا ڈر گئے۔ اور انہوں نے چپکے سے شیشی میں پانی بھر
کر رکھ دیا۔ چنانچہ ناصرو کو دوا کی بجائے پانی پلایا گیا۔ اور
اس کا بخار تیز سے تیز تر ہو گیا۔ اور وہ بے ہوش ہو گئی۔ رات
کو اذان جب اسے بے ہوشی میں بڑبڑاتے سنا تو اسی کو
بلایا اور کہا۔

”دیکھو دیم کی ماں تم بھی صاحبِ اولاد ہو۔ یہ بچی ہمارے
پاس کسی کی امانت ہے۔ اور اس کا ایک مکان بھی ہے، جس کی
ہر اسوریہ یا ہوا رآمدن ہمیں ملی رہی ہے۔ دوسرے
لفظوں میں یہ بچی خود اپنا کھاتی ہے۔ ہم پر بوجھ نہیں۔ بلکہ
ہم اس کا حصہ خود کھا جاتے ہیں۔ دیکھو تمہیں اس کا خیال
رکھنا چاہیے۔ مگر اسی پر کوئی اثر نہ ہوا۔
آج رات بھر بار بار اٹھ کر ناصرو کو دیکھئے۔ اور اسے
پانی پلاتے رہیئے۔

صبح بھائی جان بھی آگئے۔ انہوں نے جب ناصرو کی
یہ حالت دیکھی تو کہتے ہی رہ گئے، مگر کچھ نہ بولے اب اور

امی نے ان کے موڈ سے سمجھ لیا کہ انہیں اتنی پر غصہ ہے۔ جس نے
ان کی غیر موجودگی میں ناصرو کی یہ حالت کر دی۔ چنانچہ بھائی جان
نے ڈاکٹر کو بلا دیا اور ناصرو کو اسے دکھایا۔ ڈاکٹر نے بتایا
کہ اسے ڈبل منویہ ہو گیا ہے۔

امی نے ہمیں ناصرو کے قریب جانے سے نہ جانے کیوں منع
کر دیا تھا۔ شاید ان کا خیال ہو کہ ناصرو سے کہیں ہم بھی بیماری
نزلے لیں اور ہم ناصرو سے دور رہے۔ بھائی جان اور آبا جی
نے دفتر سے چھٹی لے لی۔ اور دن میں کئی بار ڈاکٹر آیا۔ اور
ناصر کو ٹیگ وینچر لگا کر لیا۔

گو امی نے ناصرو کے لئے ٹینی اور دوسری چیزیں تیار
کر دیں۔ مگر ناصرو کے قریب بھی نہ گئیں۔ اس رات میں
نے محسوس کیا کہ اگر ناصرو مجھ سے علیحدہ ہو گئی۔ تو میں ایک
بہن سے عروم موجاؤں گی۔ میں نے دیکھا کہ چھوٹے بھائی بھی
اداس اداس تھے۔ اس رات ہم آرام سے سو بھی نہ سکے۔

بھائی جان ناصرو کو اپنے کمرے میں لے گئے تھے وہ
رات بھر اس کے قریب بیٹھے رہے۔ اور اس کی خبر گیری
کرتے رہے۔ میں ناصرو کو کسی قدر آرام تھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں
تھیں۔ بھائی نے مجھے بلایا اور کہا۔

”تم ناصرو کے پاس بیٹھو میں ذرا ڈاکٹر سے مل آؤں۔“

را بیٹھ جاؤ بسیم بھیا

وہ ناصروہ کے پاؤں کی طرف بیٹھ گئے۔ اور اس کے پاؤں دبانے لگے۔

اتنے میں بھائی جان دوائے کر اندر داخل ہوئے اور ہمیں ناصروہ کے پاس اتنے دوستانہ ماحول میں دیکھ کر حیران رہ گئے۔ پھر انہوں نے دوا کی شیشی میز پر رکھ کر کہا۔

”یہ کیا دیکھ سہول رہم دونوں اور ناصروہ پریوں پہلے تو کیا ناصروہ ہماری بہن نہیں؟ میں نے آہستہ سے کہا۔

”بہت خوب بہت خوب“ بھائی جان نے خوشی سے بچوں کی طرح تالی بجا کر کہا۔ ”اگر صبح کا بھولا شام کو گھر آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہا جاتا۔ خدا کا شکر ہے کہ تم نے اسے بہن تو سمجھا اور پھر بھائی جان نے اخلاقیات اور انسانی مہر و مروت کے موضوع پر ایک لیکچر چھڑا دیا۔ اور خراب ہو گیا بھائی جان اور ابا جان کی توجہ سے ناصروہ ایک بار پھر رو بہ صحت ہو گئی۔ اور اس دن سے گویا ناصروہ کی زندگی کا ایک اور دور شروع ہوا۔

ایک شام جب سب لوگ صحن میں بیٹھ تھے۔ تو بھائی جان نے ابا جان سے کہا۔ ”ابا جان میں پوچھتا ہوں کہ اگر اس بے چارے بچی کا کیا قصور ہے؟“

اسی دن اتوار تھا۔ اور جمعہ سے سکول نہیں جانا تھا۔ میں ناصروہ کے پاس بیٹھ گئی۔ مجھے ناصروہ پر بے حد پیار آیا۔ جیسے میری چھوٹی بہن بیمار ہو۔ چھوٹے بھیا بھی کمرے میں آ گئے۔ میں بے حد اداس ممتی ناصروہ نے کہا۔

”میں مر جاؤں گی۔ رنجش بہن۔ پھر۔ پھر۔“ وہ رونے لگی۔

میری بھی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ اور میں ناصروہ سے پوچھ گئی۔ میں نے کہا۔ ”نہیں میں تہی نہیں مرنے دوں گی۔ تم تو میری بہن بڑا گنتہی کچھ ہو گیا تو میں اکیلی رہ جاؤں گی۔“ میں نے فحس کیا کہ ناصروہ کو کسی قدر حوصلہ ہو گیا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ مگر میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے میں نے اسے اوپر اٹھایا اور ناصروہ کا سر دبانے لگی۔ ناصروہ سے اظہار کیا، میں نے کہا۔ ”تم میری بہن نہیں ہو گیا؟“ میں نے جواب دیا۔

میں اس کا سر دبانے لگی۔ میں نے چھوٹے بھیا کی طرف دیکھا تو ان کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ وہ دانتوں سے اپنے ناخن اضطراب کی حالت میں کاٹ رہے تھے۔ جیسے بڑی گہری سوچ میں

میرے نے کہا۔

”کیوں کیا ہوا اسے؟“ بابا جان نے پیار سے ناصرہ کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ جو پاس ہی بیٹھی تھی۔

”آخر اسے سکول کیوں نہیں بھیجا جاتا۔ اس کا باپ اس کے نام ایک مکان اور کافی سامان چھوڑ کر مر رہا ہے۔ یہ سب ناصرہ کا حصہ ہے۔ اور ہمارا اس پر کوئی حق نہیں پھر کیوں اس کی دولت اس پر خرچ نہیں ہوتی؟“

بابا جان خاموشی سے ستر رہے۔ بھائی جان نے کچھ دیر ٹھہر کر کہا ”آئی جان کو اس سے خدا جانے کیا میرے رنر جانے دیکھوں اسے منہ سے خیالی کرتی رہے۔“ اور یہ اتنی اچھی سمجھتی ہے۔ کہ چچا پسی نے کبھی زیادتی پر احتجاج بھی نہیں کیا۔ آخر وہ آپ نے سوچا اسے مرنے کیوں ہو گیا تھا؟“ سردی میں بے اعتباطی کرنے سے بابا جان نے جواب دیا۔

”نہیں بھائی جان نے جواب دیا۔“ بلکہ اتنی نے اس سے وہ کام لیا۔ جو اتنی ہی سچی سے نہ لینا چاہیے تھا۔ یعنی ٹھنڈے پانی سے اسے کپڑے فرش اور برتن وغیرہ دھونے پڑے۔ اور نتیجہ یہ نکلا۔ کہ اسے نمونہ ہو گیا۔“

”تو کیا برتن وغیرہ ناصرہ صاف کرتے؟“ بابا حیران رہ گئے۔ انہی تو اس بات کا بچہ علم ہی نہیں تھا۔

”تو اور کون کرتا ہے؟“ بھائی جان نے کہا نہ صرف برتن بلکہ

کپڑے اور فرش بھی اس کو صاف کرنا پڑتے ہیں۔ گھر کے دوسرے چھوٹے سوٹے کام اسے علاوہ ہیں بابا جان کو اتنی پر غصہ آگیا تھی میں جان اور اتنے کام۔ انہوں نے کہا یہ مرا مرنے کا نہیں اسے پوچھتا ہوں اور انہوں نے آواز دی۔ ”وسیم کی ماں“۔ جی۔ اسی نے دوسرے کمرے سے آواز دی۔ وہ بستر بچھا رہا تھیں۔ ذرا ادھر آؤ ابانے لہا۔

اور اتنی ابانے پاس آگئیں۔ ابانے بوجھا۔

”کیا برتن کپڑے اور فرش وغیرہ ناصرہ صاف کرتی ہے؟“ تو کیا ہوا؟ اسی نے جواب دیا ”تو کیا گھروں کے کام کیا ہی کرتی ہیں۔ اور پھر سارا دن گھر میں بے کار پڑا رہنے سے تو یہ بالکل آرام طلب ہو جاتے گی۔ کبھی کبھی گھر کام کر دیتی ہے۔ تو کیا ہوا؟“ تو بھی تو ڈٹ کر ہے۔ ناصرہ روئے لگی۔ ابانے بچوں کی موجودگی میں اسی کو مزید کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا انہوں نے کہا ”اچھا تم جاؤ میں خود انہیں صاف کر دوں گا“ پھر انہوں نے کہا ”وسیم بیٹے کل سے ناصرہ سکول جانے لگی۔ تم انتظار کرنا“ کیا انہیں صاف کرنا ہے؟ اسی نے غصے سے کہا۔ میں بھی تو سونے نہیں ایک ہی تو دشمن ہوں۔ اسی کی

”میں کہتا ہوں۔ اب جاؤ اور اپنا کام کرو۔“ ابانے سسٹنی سے کہا۔ اور اسی بڑ بڑاتی ہوئی چلی گئیں۔ ابانے کہا۔

وسیم بیٹے :-

”جسم بھائی جان نے کہا۔

”سکول سے ناصرہ سکول جائے گی۔ تم اسے سکول داخل کرو یا آنا :
”بہتر ابا جان۔ بھائی جان نے کہا۔

ادھر بھائی جان ناصرہ کو پیار کر رہے تھے۔ ناصرہ بھی خوش
ہو گئی تھی۔ میں نے کہا :..... ”بھائی جان چار۔ یہ سکول میں داخل
کر دینی گے نا۔“

”ہاں ہاں رضیہ“ بھائی جان نے کہا : ”اب دونوں بہنیں اکٹھی
سکول جایا کر دگی۔ اسے بھی ساتویں جماعت میں داخل کروا
دوں گا۔ تمہارے سامنے۔“

اور میں نے ناصرہ کو زور سے بازوؤں میں تھیکے سینے
سے لگا لیا۔



ناصرہ اور میں اکٹھی سکول جانے لگیں۔ اور اس طرح ناصرہ کو
بھی سپیدیوں میں مل بیٹھنے اور باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کا موقع
مل گیا۔ مگر بھائی جان ناصرہ کو اس بات کا احساس نہ ہونے دیا تھا۔
مگر پھر میں اس پر ایک مایوسی بھائی ہوئی تھی۔ مایوسی کی یہ لہر طے
ہی دور ہو گئی۔ اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ کہ ہر وقت میلے کپڑے
میں رہنے والی ناصرہ جو بات بات پر آنکھوں میں بے کسی کے آنسو بہ
لیتی تھی کہیں قدر بدل گئی ہے۔ اس نے بہت جلد سکول میں بہت سی
سہمیوں یا بیٹنوں سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی مگر جب بھی ماں

باپ کا ذکر آنا وہ اداس ہو جاتی اور ان کا منہ دیکھنے لگتی۔

سکول میں سہیلیاں اسٹے ماں باپ کی بات کرتی ہوئی کہتی
میرے ابا جان میرے بے نیاسوت لائے۔
اور کوئی دوسری بتلاتی۔

کہ میری اتنی مجھے اپنے ساتھ فلاں دکھانے لگیں۔ اور اللہ قسم وہ
خزا کیا۔ کہ کب کتابوں اتنی اچھی فلم ملتی۔
اور پھر وہ فلم کی تھائی سناتی۔

مگر صرہ ایسے وقت میں فلم کی کہا جاتی سننے کی بجائے کچھ سچ چتی
رہتی۔ دوسری لڑکیاں اس کا دکھ نہ جان سکتی تھیں۔ مگر مجھے معلوم
تھا۔ وہ گیا سوچ رہی ہے؟ میں اسے ہر طرح سے یقین دلاتی۔ کہ
میں اس کی بہن ہوں اور وہ مجھے باجی کہہ کر پکار کرے اور سبھا
کرے۔

گو اس نے مجھے باجی کہہ کر لیا ناشہ دنا کر دیا۔ اور میں
نہیں رہا اسے بعد اس طرح گل گل مل گئی۔ کہ وہ بہن بھائیوں کا دکھ
سمجھ لگتی۔ اور مجھے بہن بنالیا۔ مگر اس کے باوجود اس کے
دل میں چھپا ہوا ماں باپ کا پیار ختم کرنا میرے بس کی بات
نہ تھی۔ وہ اکثر اداس ہو جاتی اور کئی بار میں نے اسے چھپ کر
روتے دیکھا۔

البتہ جانی جان کی موجودگی بہ وہ کہہا اداس نہ ہوتی اور نہ

کبھی روتی۔ بھائی جان اس سے بدستور شہید پار کرتے
اور اس کی ضروریات کا خیال رکھتے رہے۔

ایک روز میں نے بھائی جان سے کہا
بھائی جان یہ ناصر نہ جانے کیوں باتیں کرتی کرتی چپ بھاتی
ہے اور روٹے لگتی تھبتہ۔

کیوں ناصر کہتا بات ہے؟ بھائی جان نے پوچھا
نہ کچھ بھی تو نہیں۔ وہ بولی لاٹھیہ بن یونہی کہہ رہی ہیں۔ نہیں بھائی
جانی میں نے بتایا۔ دراصل اسے اپنے ماں باپ بہت یاد تھی۔
میں سکول میں جب لڑکیاں ماں باپ کی باتیں کرتی ہیں۔
اور ناصر ان کی باتیں سن کر چھپ چھپ کر روتی ہے۔
یقیناً اسے اپنے ماں باپ نظر آتے ہیں اور

....

بھیا سوچ میں پڑھ سکے پھر بولے۔

ناصر تم ہماری بیٹی ہو۔ تم نیچے ڈیڑھی کہا کرو۔ بھائی جان
نے کہا۔ ہم تمہارے ابا بن جائیں گے؟ آبا جی بھائی جان ابا
بن جائیں گے۔ میں چننے لگا۔

مگر بھائی جان نے اس کا کوئی نوٹس نہ لیا اور ناصر کو
رضا مندر لیا۔ امی نے سنا تو بولیں۔

کیا تیری عقل خراب ہو گئی ہے۔ رٹ کے جو ایکہ تیم رٹ کی سے

کہہ رہا ہے۔ کہ تجھے ڈیڑی کہا کرے۔ کہہ کہ تو دیکھے میں اس کی ٹانگیں توڑ دوں گی۔ زبان کچنچ لوں گی۔ میں نے تیری شادی نہیں کرنی کیا؟

”تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ بھائی جان نے کہا۔
”فرق کیوں نہیں پڑتا؟ بس سوال والے کہیں گے پہلے ہی بچوں کا باپ ہے۔“

”آپ تو بس یونہی اُمی ناراض ہوتی رہتی ہیں۔ بھائی جان نے کہا۔ اس سے چار۔ بی بی کا دل بھل جائے گا۔ میرا اس سے کیا بگڑے گا؟“

اُمی ناراض ہوتی رہیں۔ مگر بھائی جان نے انہیں رضا مند کر ہی لیا۔ اُمی بھائی جان کی بات مان لیتی تھیں۔

اور جب ابا جان نے سنا تو صرف مسکرا دیئے۔ وہ بھی بھائی جان کے کاموں میں بہت کم دخل دیا کرتے تھے۔

ناصرہ بھائی جان کو ڈیڑی کہنے لگی۔ اس سے اسے کچھ شکین ہوئی۔ بھائی جان تو شرد سے اسے میں کی طرح چاہتے تھے۔

پھر وقت گزرتا گیا۔ مئی بھی پانچ چھ سال کی ہر مئی اور مہ بھی نویں جماعت میں پہنچ گئے۔

چھوٹے بھتیجی ہیں اور ناصرہ ایک ہی جماعت میں تھے۔ ہمارے

جسم میں باغیت کے نشان پیدا ہو رہے تھے۔ اسی لئے اُمی اب ہمیں اکیلے باہر جانے کی اجازت نہیں دیتی تھیں۔ بچپن کے کھیل بھی ختم ہو گئے تھے۔ اور ان کی جگہ بڑوں والے کھیلوں نے لی تھی۔ میں ۱۴ سال اور ناصرہ پندرہ سال کی ہو گئی تھی۔

گوا آ اور بھائی جان نے اُمی کو منع کر دیا تھا۔ کہ وہ ناصرہ سے گھر کا کوئی کام نہ کریں۔ مگر ناصرہ کو احساس تھا کہ اسے اُمی کا ہاتھ بٹانا چاہیے۔ چنانچہ وہ سکول سے گھر آتی۔ بستہ پڑھائی والے کمرے میں رکھ کر خود اُمی کا ہاتھ بٹانے لگ جاتی۔ اب وہ اپنی خوشی سے برتن صاف کرتی۔ کپڑے دھوتی اور کھانا وغیرہ بھی پکالیتی۔ ان کاموں کے دوران اُمی بدستور اسے گایاں اور جھڑکیاں دیتی رہتی۔ مگر ناصرہ ان سب باتوں کی عادی ہو چکی تھی۔ وہ خاموشی سے سب سنتی اور اپنا کام ختم کر کے پڑھائی والے کمرے میں آ جاتی۔ اور سکول کا کام ختم کرتی۔

چھوٹے بھتیجی بھی بڑکیوں سے نہ کھیلنے تھے۔ وہ سکول سے آنے تو محلے کے بڑکوں سے یا گراؤنڈ میں فٹ بال اور کرکٹ کھیلنے چلے جاتے۔ انہوں نے اب ناصرہ کو تنگ کرنا چھوڑ دیا تھا

البتہ جب موڈ میں ہوتے تو اسے تنگ کرنے سے نہ چوکتے
انہوں نے ناصرہ کی کتابیں اور کتابیں پھاڑنا اور اسے مار کر
بھاگ جانا چھوڑ دیا تھا۔ بلکہ جب بھی دونوں کوئی بات
کرتے بڑے آرام اور تہذیب سے کرتے تھے۔

ناصرہ جوں جوں جوان ہو رہی تھی۔ بڑی خوبصورت اور
سلیقہ مند ہو رہی تھی۔ خاموشی طبیعت تو وہ ابدا ہی سے
تھی۔ اور شاید اسی کی خاموشی طبع کی وجہ سے اسی کی عروسی
ہو جو ماں باپ کی موت کے بعد اس کا مقدر بن گئی تھی۔

اسی نے بھائی جان کے کہنے سے سکول کی سرگزینیاں
میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ دوسرے آبا جان کے
کہنے پر چھوٹے بھتیجا بھی سکول کی سرگزینیاں میں حصہ لیتے تھے۔
سال کے آخر میں جب سکول کے تقریری میں مقابلے ہوتے
تو ناصرہ نے بھائی جان سے کہا۔

”ڈیڑی میں بھی حصہ لینا چاہتی ہوں۔“

”ہاں ضرور بھائی جان سے کہا۔“

اور اسے تقریر کی خوب تیاری کرائی۔ تقریر کا عنوان
تھا۔ ”ہمارے معاشرے میں لڑکے اور لڑکیوں کے لئے
ایک ہی سکول یا کالج میں تعلیم بہتر ہے۔ یا مضر؟“
ابا جان نے چھوٹے بھتیجا کو تقریر کاہ دی اور انہیں نقطہ

سمجھائے جبکہ بھائی جان نے ناصرہ کو تقریر یاد کرائی۔ دونوں
نے خوب مشق کی۔ ابھی تقریری مقابلوں میں ایک مہفتہ باقی
تھا اس مقابلے میں پہلا انعام شیلڈ کے علاوہ پانچ سو روپیہ نقد
تھا۔

اور تقریر کے مقررہ دن سے چار دن پہلے ناصرہ نے چھوٹے
بھتیجا کو صحن میں گھوم گھوم کر کچھ یاد کرتے دیکھا۔ تو کہا۔
”کیا بات ہے بڑی تیاری ہو رہی ہے۔ کیا کوئی
خاص امتحان ہے؟“

”ہاں خاص امتحان ہی تو ہے؟“ بھتیجا نے کہا۔

”کس مضمون کا ناصرہ نے کہا۔“

”مضمون کا نہیں بلکہ صوبے بھر کے سب سکولوں کا انعامی مقابلہ
ہونے والا ہے۔ اور میں اس میں حصہ لے رہی ہوں۔“

”کیا عنوان ہے؟“ ناصرہ چونک پڑی۔

”عنوان ہے۔ ہمارے معاشرے میں لڑکے اور لڑکیوں

کی ایک ہی سکول میں تعلیم بہتر ہے یا مضر؟“

ناصرہ چونک پڑی اس نے سمجھ لیا۔ کہ بھتیجا بھی اسی
مقابلے میں حصہ لینے والے ہیں۔ جس میں وہ خود حصہ لے
رہی ہے۔ پھر اس نے کہا۔

”آپ اس کے حق میں بولیں گی یا خلاف؟“

”تہیں ہر حال حصّہ لینا ہوگا۔ بھائی جان نے جواب دیا۔ جاؤ تیار کرو اور خوب تیار ہو کر تقریر کرو۔ اگر تم جیت گئیں تو ہمیں تم ہی اچھا سا تحفہ دیں گے۔“

ناصرہ چھوٹے بھیا کے مقابلے میں نہ آنا چاہتی تھی۔ مگر بھائی جان کے مجبور کرنے پر وہ رضا مند ہو گئی۔ اور اسی نے مقابلے میں حصّہ لینے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر پھر بھی وہ چھوٹے بھیا سے بات کر لینا چاہتی تھی۔ تاکہ بعد میں وہ ناراض نہ ہوں۔ چنانچہ وہ چھوٹے بھیا کے کمرے میں گئی۔ اور پوچھا ”فرمائیے تقریر کہاں تک تیار کی؟“

”بس تیار ہی ہے۔ اسی بار تو وہ پڑھے ارادوں کا کہ پناہ نام جیب میں بند ہے۔ بڑی زوردار تقریر تیار کی ہے۔“ اور میں بھی حصّہ لے رہی ہوں۔ ناصرہ نے آہستہ سے کہا۔ ”بھیا۔ حیرانی سے بولے۔ ”یہ تو تم نے پہلے بتایا ہی نہ تھا۔“ ”ہاں۔“ ناصرہ نے کہا۔ ”تیرے بھائی جان کی خواہش ہے۔ کہ میں مقابلے میں حصّہ لیکر تم کو آزمانی کروں۔“

”بھئی بہت خوب۔“ بھیا بولے۔ ”مرہ آجائے گا۔ تو کیا تم بھی۔“ حق میں تقریر کر دگی۔

”نہیں۔“ ناصرہ نے کہا۔ ”خلاف۔“

”خوب خوب بھیا نے زندہ دلی کا ثبوت دیا۔“ بھی مرہ آ

”حق میں بھیا نے جواب دیا۔“

ناصرہ خاموشی سے بھائی جان کے کمرے میں چلی گئی۔ خوش قسمتی سے بھائی جان موڈ میں تھے۔ انہوں نے کہا۔

”لو ہاں ناصرہ کیا خیال ہے تقریر یا نہ ہو گئی؟“

”جی ہاں۔“ ناصرہ نے کہا۔ ”مگر میں مقابلے میں حصّہ نہیں لوں گی۔“

”مگر کیوں؟“ بھائی جان چونک پڑے۔

”بس یونہی۔“ ناصرہ نے کہا۔

ناصرہ گئی بھائی جان کے تیار ہوا کرتا کرتا تھی۔

تباہ کیا بات سے کیا ہمت ہار گئیں؟

”نہیں۔“ ناصرہ نے کہا۔ ”تسلیم صاحب بھی اس مقابلے میں حصّہ لے رہے ہیں۔“

”تو پھر کیا ہوا؟“ بھائی جان نے حیرانی سے پوچھا۔

”وہ موضوع کے حق میں تقریر کریں گے۔“ ناصرہ نے جواب دیا۔ ”اور میں نہیں چاہتی ان کے خلاف تقریر کروں۔“

”تمہاری یہ سوچ غلط ہے۔“ بھائی جان نے کہا۔ ”یہ محبوبیت ہے۔ ہر شخص کو اپنا خیال ظاہر کرنے کا حق حاصل ہے۔ تم بھی دلائل دو وہ بھی دلائل دیں گے۔ جو جیت جائے گا۔ وہ انعام لے گا۔“

”مگر۔“ ناصرہ نے کہا۔ ”چاہا۔“

جائے گا۔ اور پتہ چل جائے گا۔ کہ کون کتنے پانی میں ہے
پھر بھیا ایک دم خاموشی ہو گئے۔ اور کچھ سوچتے رہے پھر
بولے "ناصرہ اگر تم پہلا انعام لینا چاہتی ہو۔ تو میں مقابلے
سے دست بردار ہونے کے لئے تیار ہوں۔"

"اور میں بھی یہی کہنے آئی تھی۔" ناصرہ نے کہا۔
"خوب۔" بھیا بولے "تو اس کا مطلب یہ ہے کہ
دونوں قسمت آزمائی کریں۔ اور فیصلہ قسمت پر چھوڑ دیں۔
ناصرہ صرف مسکرا دی۔

مقابلے کا دن آن پہنچا۔ ابا جان۔ بھائی جان۔ میں
اور میری سہیلیاں مقابلہ دیکھنے گئے۔ مگر نہ معلوم میری یہ
خواہش کیوں تھی۔؟ یقیناً ابا جان اور بھائی جان بھی یہی
سوچ رہے ہوں گے۔ کہ ناصرہ جیت جائے

بھائی کے مقابلے میں میں منہ بولی بہن کی خوشی
زیادہ عزیز تھی۔ مقابلے کے چوتھے نمبر پر بھیا کا نام پکارا گیا
وہ ڈانس پر آئے اور دھواں دھار تقریر کی۔ اور ان کی
تقریر کی داد دی گئی۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ ان کی تقریر میں
جذبائیت زیادہ تھی۔ اور دلائل کم۔

آٹھویں نمبر پر ناصرہ کی باری آئی۔ اور وہ آہستہ پر آئی دالسی
پر کھڑی ہو بہت بھولی بھالی اور بیاری لگ رہی تھی۔ مجھے اس پر

اس پر بے اختیار پیار آیا۔ اس نے نہایت آہستہ آواز
میں اور ہنسنے ہنسنے شروع کی اس کا لہجہ بہت پیارا تھا۔
اور اس نے اتنے محسوس دلائل دیے کہ سب سے زیادہ اسے
داد ملی۔ سامعین نے اس کے ہر فقرے پر تالیاں بجا دیں۔
بھیا اور ابا بھی مسکرا مسکرا کر تالیاں بجا رہے تھے۔

آخر ججوں نے فیصلہ سنا دیا۔ اور ناصرہ کو اول
انعام دیا گیا۔ اسے شیلڈ اور پانچ سو روپیہ نقد انعام ملا۔
بھیا کو دوسرا انعام ملا۔

صگسہا میں نے محسوس کیا کہ ناصرہ یہ انعام حاصل
کر کے زیادہ خوشی نہ تھی۔ اس نے جیکے سے انعام لینا
اور ہم سب گھر واپس آ گئے۔ امی نے بھیا کو دوسرا انعام ملنے
کی خوشی میں امی کی خوب ہلائی لی۔ اور شاباش دی۔

جبکہ ناصرہ کو اول انعام ملنے پر انہوں نے تعریف کا ایک
لفظ بھی نہ کہا۔ مگر یہ سب کچھ ہمارے اور ناصرہ کے لئے
غیر متوقع نہ تھا۔ امی سے ہم سب کو ایسی سکوکی کی امید
تھی۔ مگر شام کو سب چھوٹے بھیا اپنے کمرے میں سکون کا
کام کر رہے تھے۔ ناصرہ ان کے کمرے میں گئی اور انعام کی رقم
اور شیلڈ بھیا کے سامنے ڈال دی۔

بھیا یہ کہہ۔ یہ تمہارا حصہ ہے۔ بھیا نے کہا۔

”نہیں سلیم صاحب۔ وہ بولی آپ اولیٰ انعام حاصل کرنے کے خواہش مند تھے۔ میں مقابلے میں حصہ نہ لیتی۔ تو آپ اولیٰ انعام جیت جاتے۔“

”بھئی یہ تمہاری قابلیت اور میری قابلیت کا امتحان تھا۔ اور تم مجھ سے بازی نہ لگتی۔“ بھیا نے کہا۔

”میں نے آپ کا دل دکھایا ہے۔ وہ بولی میں معافی چاہتی ہوں۔ آپ اپنا انعام مجھے دے دیں۔ اور میرا انعام خود دے لیں۔“

وہ تقریب جھکا کر بات کر رہی تھی۔ جیسے اس میں بھیا سے آنکھ ملانے کی ہمت نہ ہو۔

”نہیں ناصر عام اسے بھی اپنی فسق خیالی کرتے ہیں۔ تم میری کچھ نہیں لگتی۔؟“

بھیا خاموش ہو گئے اور جواب کا انتظار کرنے لگے۔ ناصر نے اچانک ہلکیں اٹھائیں۔ اور بھیا کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔

ان کی آنکھوں میں بے پناہ پیار جھلک رہا تھا۔ جس کا اپنا شیتہ تھی۔ اور ان کی آنکھیں پوچھ رہی تھیں۔

”نہیں میری کچھ نہیں لگتی۔؟“

”نہیں ہوں۔ ناصر نے کہا۔ مجھے تو انعام بدلنے آئی ہیں۔“

”تو تم اپنا انعام اپنے پاس رکھو۔ اور میرا میرے پاس رہنے دو بھیا نے کہا۔ ناصر نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ نہ جانے کس سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ بھیا نے جواب کا انتظار کیا اور جب ناصر خاموش رہا تو انہوں نے کہا۔

”خدا تمہیں اور بہن سی کا دیا پیار دے۔!“

پھر انہوں نے میز پر سے گلاب کا تازہ پھول اٹھایا۔ اور ناصر کے بالوں میں لگا دیا۔ ناصر نے نظریں اٹھا کر بھیا کی طرف دیکھا مگر معصومیت کی زبان میں دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔ وہ یہ نہ جان سکے کہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

ناصر نے آہستہ سے انعام کی چیزیں اٹھائیں اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

بھیا جان کی شادی کی بات چل رہی تھی۔ بہن سے رشتے آئے مگر سب ناخاندان ہو گئے۔ بھیا جان کو تو کوئی لڑکی پسند نہ آ رہی تھی۔

کبھی کے کان بڑے کسی کا منہ چھوٹا۔ کوئی چھوٹے قد والی اور کوئی کالی۔ اگر کسی میں بھی جسمانی خوبیاں موجود ہوتی تو تعلیم کم اور ہمارے بھائی جانی تھے اہم۔ اور انہیں اپنے سے کم تعلیم یافتہ لڑکی چھوٹی ہی نہ تھی۔

جہاں کہیں اُمی جا تیں میں بھی ساتھ جاتی ایک دو ٹیکہ
تو تارہ بھی بھائی جان کے کہنے سے۔ انٹی کے ساتھ چلی
گئی۔

اور پھر ایک اور رشتے کے بارے میں بات بیت
چلی نکلتی یہ رشتہ اپنے ہی شہر میں تھا۔ لڑکی خوبصورت
تھی۔ تعلیم یافتہ تھی۔ مگر تھی یتیم۔ ابا نے اُمی سے کہا کہ وہ
جاوے۔

اور لڑکی کو دیکھ کر اُمی کو۔

ایک روز اُمی میں اور تارہ تینوں لڑکی والوں کے
باپ پہنچے۔ لڑکی ہمیشہ پسند آگئی اور اُمی کو بھی۔ مگر جب
جہیز وغیرہ کا ذکر چھڑا۔ تو لڑکی کی ماں نے صاف کہہ
دیا کہ لڑکی کا باپ نہیں ہے۔ وہ تو چڑھ چکے اور ایک
آدھ زپور مشکل سے دے سکے۔ اُمی تو خاموش
ہو گئیں۔ اور ہم نے سمجھ لیا کہ یہ رشتہ ناممکن کر دیا جائے
گا۔

کیونکہ اس سے پہلے بھائی جان بھی تو ایک غریب خاندان
کی لڑکی کا رشتہ بناؤں ناممکن کر چکے تھے۔

اُمی داپوں آگئیں۔ اور ابا سے تمام وہ قہات بیان
کر دیئے۔ اور لڑکی والوں کی عزت کی داستان تو کچھ زیادہ

ہی مریج مسالہ لگا کر بیان کی۔ چنانچہ رات بٹتے بٹتے رو گئی
مگر اس رات نہ جانے۔ بھیجا کو کیا ہوا۔ کہ صبح اُمی نے
ہی انہوں نے اعلان کر دیا کہ شادی کر دیا گیا۔ تو اُمی

گھر میں۔ ورنہ تمام عمر کنوارے رہی گئی۔
”ارے لڑکے“ اُمی نے کہا۔ خانی جامعہ داپن گھر
آئے گی۔ اور پھر بھوکوں کی داپن کہیں باتیں نہیں کرے گی
تو کیا کرے گی۔؟

”مگر اُمی تعلیم یافتہ تو ہے نا۔ بھائی جان نے کہا۔
تعلیم سے کیا ہوتا ہے اُمی نے کہا۔ سرٹیفکیٹ کو چائے کا
بیوٹ کر۔ میں تو ایسی یتیم کو آگ لگاتی ہوں۔ جو.....“
”بسوں بس..... اُمی بھائی جان نے کہا۔ اگر اُمی کرنی ہے
تو اُمی جگہ کہ دو۔ ورنہ پھر مجھ سے شادی کا ذکر کہیں مت
کرنا۔“

ابا سب کچھ سن رہے تھے۔ اُمی کو پاس آئے اور
بھیا کے سر پر ہاتھ پھر کر بولے۔

”مٹھک ہے بیٹے ہمیں تمہاری خوشی عزیز ہے۔ مگر
نہ کرو اُمی ابا کی طرف دیکھ کر کہیں۔ جان بھائی جان کی طرف
دیکھ کر مسکرا دیے اور بھائی جان خوشی خوشی اپنے کمرے
میں چلے گئے۔“

حصہ دیا۔ اور بھائی جان کی شادی کی تیاریاں کرتی رہی
دوسری طرف ہم سب امتحان میں مصروف رہے۔ رات
گئے تک میں اور ناصرہ اکٹھی پڑھتی رہیں اور چھوٹے بھتی
بھی اپنے کمرے ہی جاگتے رہے۔ اور کتا بوں کی ورق
گردانی میں مصروف رہے۔ امتحان میں بہت کم دن رہ
گئے تھے۔ کہ ایک حادثہ ہو گیا۔

میرے اور ناصرہ ایک کرائے کے تانگے میں سکول
جایا کرتی تھیں۔ تانگے والا میں ہر روز صبح گھر سے لے لینا اور
چھٹی کے وقت سکول سے تانگے پر گھر لے آتا۔ عرصہ سے
ہمارا یہ معمول تھا۔

ہمیں ایک روز تانگہ اچانک چھل گیا۔ ہوا یوں
کہ بارش کی وجہ سے چھلن ہو گئی تھا۔ یہ ہوا گھوڑے کا
پاؤں چھلنی پر پڑا۔ وہ دمھرام سے سڑک پر جا گرا۔
اور تانگہ جھرا اٹھ گیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ہم لوگ بھی گر پڑے۔ مگر بد قسمتی
سے ناصرہ کی ٹانگہ پیٹھ سے نیچے آگئی۔ اور اسکی
کی بڑی ٹوٹ گئی۔

میری کمر پر صحن دو ایک معمولی فواشیں آئیں
بے شمار لوگ جمع ہو گئے۔ اور مناسبتی کو ہسپتال

ناصرہ اس دن بے حد خوش خوشی پھرتی رہی۔ سکول میں ہر
ایک کو بتاتی رہی۔ کہ بھائی جان نے اس کے کہنے سے اس کی لڑکی
کی لڑکی سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

در اصل بات یوں ہوئی کہ ناصرہ کو وہ لڑکی پسند
گئی اس نے گھر آجا کر بھائی جان سے ذکر کیا۔ انہوں نے کہا
سے تقدیر کر اسے بغیر دین شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

ناصرہ کی اس سے بڑی فحش اور کولنی ہو سکتی تھی۔ مگر
کو تو ناصرہ سے خدا واسطے کا بہر تھا۔ انہیں جب یہ معلوم ہوا
کہ بھائی جان نے ناصرہ کی پسند یہاں کی ہے۔ اور روز
دے کر اس یتیم لڑکی کو بھونا کر گھر لانے کا فیصلہ کر لیا ہے
تو وہ ناراض ہو گئی۔ اور کئی روز تک بات چیت میں ناصرہ
کو برا بھلا کہتی رہیں۔

سالانہ امتحان سر پر آگئے تھے۔ جہاں میں اور ناصرہ
یتیموں دسویں جماعت کا امتحان دے رہے تھے۔ اور ابا
کا خیال تھا۔ کہ بچوں کے امتحان کے بعد بھائی جان کو شادی
کی تاریخ مقرر کریں گے۔ اس لئے ابھی سے تیاریاں ،
شروع ہو گئی تھیں۔

خرید و فروخت اور دیگر سامان بنانے شروع
ہو گئے تھے۔ ناصرہ نے سب کاموں میں بڑھ کر

پہنچا دیا گیا۔

میں دوسرے تانگے میں گھر پہنچی صرف اتنی گھر پہنچیں۔ انہوں نے سنا تو گویا ان کے بیٹے میں مسٹرک پڑ گئی۔ میں اب تک نہ جان سکی کہ امی کو ناصرو سے اتنی عداوت اور نفرت کیوں تھی۔ اس کے مکان کی آمدنی سے تو گھر کا خرچ بھرتی ہو رہا تھا۔ اور امی کچھ نہ کچھ پس انداز کر رہی تھیں۔ اور اسی سے امی نفرت کرتی تھیں۔

بہر حال امی نے سنا کہ صرف اتنی قدر کہا۔

”گھر میں کوئی مرد نہیں ہے۔ میں کیسے ہسپتال جاسکتی ہوں۔“ امی نے جمل کر کہا، ”مرد توڑی جانے لگا۔ تمہارے با آئیو کے تو بتا دوں گی۔ جا کر دیکھ آئیں گے۔“

گھر میں کوئی

اور سب خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر بعد چوڑے بھیا بھی آ گئے۔ انہوں نے اطمینان سے کھانا کھایا اور پھر تھوڑے بچہ چھانا ناصرو دکھائی دیں۔ وہ رہی۔ کہاں ہے آج۔

میں نے انہیں بتایا۔ ناصرو کو حادثہ پیش آ گیا۔ اور اس کے ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ امی نے تو اس کا کچھ پتہ نہیں دیا۔ یہ چار ہی ہسپتال میں اکیلی پڑی ہے۔ دکھ

اور مصیبت میں کوئی اپنا پاس نہ ہو تو دکھ بڑگا معلوم ہوتا ہے۔ جیسا۔“

جیسا خاموش خاموشی سے ہو گئے۔ پھر انہوں نے کہا۔ ”میں ابھی جاتا ہوں۔ تم بھی چلو گی۔“

”ہاں جیسا میں نے یہ تاجی سے کہا۔“ مگر کتنی اگر پتہ چل گیا کہ آپ ہسپتال میں جا رہے ہیں۔ تو آپ کو وہاں نہ جانے دیں گے۔“

”تو تم مت جاؤ۔ وہ بوسے۔“ میں بغیر امی کو بتائے چلا جاتا ہوں۔“

پھر انہوں نے امی سے کبھی بہانے پیشے وغیرہ ملے۔ اور ہسپتال چلے گئے۔ امی نے مجھ سے کہا۔

”دیم کو آتے ہی نہ بتا دینا۔ کہ امی کی لاد ملی ہسپتال میں پڑی ہے۔ کھانا پینا تھرا م کر لے گا۔ نہ جانے کیا جا دو کر دیا ہے۔“ ڈاکٹر نے میرے چپے پر۔ ”اچھا۔ امی میں نے جواب دیا۔“

اس روز بھائی بھائی خلاف معمول دیر سے گھر آئے۔ انہوں نے لباس تبدیلی کیا۔ اور چوہنی وہ منہ لے کر دھو کر کھانا پر بیٹھے

انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

ناصرہ کہاں ہے ؟

وہ حیران تھے کہ ناصرہ جو ہر دروازے کا استقبال کرتی تھی۔ آج کہاں ہے۔ اور کیوں دکھائی نہیں دے رہی؟ میں نے جواب نہ دیا بلکہ امی کی طرف دیکھنے لگی۔ اور اتنی نے بھی کوئی جواب نہ دیا کیا بات ہے؟ وہ بولے میں نے بھی کوساری بات بتا دی۔

تو بھانے ایک دم کھانا چھوڑ دیا۔ اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ سخت گھبراہٹ میں تھے۔ اور بولے بھئی میں ناصرہ کا پوچھ رہا ہوں۔ وہ کہاں ہے۔ اور تم لوگ میرا منہ دیکھ رہے ہو۔ آخر بات کیا ہے؟ میں نے امی کی طرف دیکھا۔ اور پھر میا کو ساری بات بتا دی۔

”تو تم نے مجھے پہلے ہی کیوں نہ بتایا؟ بھائی جان بے حد فکر مند رہے ہیں۔ آج ویسے بھی کام کی زیادتی کی وجہ سے مجھے دفتر سے دیر ہو گئی۔ وہ بے چاری تنہا میری راہ دیکھ رہی ہوگی۔ آف۔۔۔“

بھائی جان کو ہمیشہ دنیا سے شکایت رہتی تھی۔ میں نے بتایا۔ کہ چھوٹے بھیا ہسپتال میں اس کے پاس ہوں گے۔

ابنیں کسی قدر تسلی ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے کھانا کھائے بغیر لباس تبدیل کیا۔ اور جو نہی جانے کے لئے تیار ہوئے۔ آتا بھی آ گئے۔

”کیا بات ہے؟“ وسیم بیٹے۔ انہوں نے بھائی جان کے موڈ سے اندازہ کر کے کہا: کچھ نگرہ مند سے معلوم ہوتا ہے۔ وسیم کہاں ہے۔ ناصرہ کہاں ہے؟

بھانے بتایا کہ ناصرہ کا ایکسڈنٹ ہو گیا ہے اور اس کی ٹانگہ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ سلیم ہسپتال میں اس کے پاس ہے۔

چنانچہ ابائے بھی اٹھے پاؤں بھائی جان کے ساتھ ہسپتال جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں بھی ان کے ساتھ چلی۔

جو نہی ہم ہسپتال میں داخل ہوئے ہمیں تسلی ہو گئی۔ ناصرہ کسی قدر اطمینان سے بستر پر لیٹی ہوئی تھی اور بھیا اس کے سر پر بیٹھے۔ اس سے باتیں کر رہے تھے۔ میز پر پھل اور ایک رسالہ پڑے ہوئے تھے۔ جو بھیا ناصرہ کے لئے لائے تھے۔ میں بھیا کی عادت سے خوب واقف تھی۔ جب وہ بیمار کے موڈ میں ہوتے تو گلہ باز کا ایک بڑا پھول ناصرہ کے بالوں میں لگا دیتے۔ اس وقت بھی ناصرہ

کے بالوں میں ایک گلاب کا بڑا سا مٹرخ پھول لگا ہوا تھا۔
بھائی جان نے ناصرو سے جانتے ہی حال پوچھا۔ اس کے
چہرے پر بھائی جان کو دیکھ کر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اور اس نے
بتایا کہ اب درد کم ہے۔ ڈاکٹر دیکھ کر گیا ہے۔ اس نے
بتایا ہے کہ صبح آپ رشتی ہو گا۔
بھرا بابا جان نے ناگہ دیکھ کر کہا۔

”خدا کا شکر ہے کہ بڑی زیادہ ٹکڑے ہونے سے بچ گئی
ہے۔ میرا خیال ہے۔ ایک دو ہفتوں تک آرام آ جائے
گا۔“

”مگر میرا تو دو ہفتوں کے بعد امتحان ہونے والا ہے
ناصرہ نے کہا۔ بیٹی جان ہے۔ تو سب کچھ ہے۔ امتحان تو
ہوتے ہی رہیں گے۔ پھر سہی۔“

”نہیں ابا جان“ بھائی جان نے ناصرو کے چہرے پر
غم کی یہ چھائیاں دیکھ کر کہہ دیں۔ میں ناصرو کو کتا میں یہاں لا
دوں گا۔ یہ بیٹی پڑھتی رہے گی۔ میرا خیال ہے چند روز
بعد تو یہ گھر آ جائے گی۔ پلٹر لگ گیا۔ تو ہسپتال سے جانے
کی اجازت مل جائے گی۔ تب ابا جان نے کہا۔ ”یہ ٹھیک
ہے۔“

”خدا کرے تب تک یہ ٹھیک ہو جائے۔ پھر اس کا

سالی صالح نہ ہو۔“

پھر بھائی جان نے ناصرو کو اپنے اہمیت سے بھیل کھلائے
اور اچھی اچھی باتیں کیں اور اس رات، میں ناصرو کے پاس
ہسپتال میں رہی۔ مجھے ناصرو کی خدمت کر کے بڑا مزہ
آیا۔

پھر ناصرو کی اور میری کتابیں ہسپتال میں آ گئیں۔ اور ہم
چار دن ہسپتال میں رہیں۔

اس رسم دوران میں نے خوب جی بھر کر باتیں کیں
اور پڑھائی بھی کی۔ ناصرو کی ٹانگ پر پلٹر چھو دیا گیا تھا
اور اسے ہسپتال سے جانے کی اجازت مل گئی تھی۔

اس دوران میں اچھی ایک بار ہسپتال کا دورہ کر
گئیں۔ شاید یہ دورہ ابا جان اور بھائی جان کے اصرار پر
کیا ہو۔ بھائی جان روز آتے اور گھنٹوں ناصرو سے مزے
دار باتیں کرتے رہتے۔ ابا جان روز چھ دسٹے اور اچھی اچھی
چیزیں لاتے رہے۔

چھوٹے چھوٹے دن بھی دوتن چیکر ضرور لگاتے
اور اپنے ساتھ گلاب کا مٹرخ پھول ضرور لاتے اور جب
میں کسی کام سے باہر جاتی۔ اور واپسی پر دیکھتی تو وہ
پھول ناصرو کے بالوں میں لگا ہوتا۔ اہم ناصرو

بھائی جان کی سٹ دی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ اور گھر میں
 زور و شور سے تیاریاں ہونے لگیں۔ بس لوگ مصروف
 رہتے۔ اور گھر میں اکثر میں چھوٹے بھیا اور ناصرہ ہوتے
 اس وقت میں نے محسوس کیا کہ چھوٹے بھیا ناصرہ
 میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ دوسری
 طرف ناصرہ کا بھی یہی حال تھا۔ وہ بھی جان جان کے بد جس
 شخصیت سے سب سے زیادہ متاثر تھی۔ وہ بھیا ہی تھے اور وہ
 ان سے سب سے زیادہ باتیں کرتے تھے۔ چھوٹے بھیا کی خوشی پر اپنی
 خوشی قربان کر دیتی۔ اور ہر بات میں چھوٹے بھیا کی پسند
 اور ناپسند کا خیال رکھتے تھے۔
 مگر انہوں نے کبھی ایک دوسرے سے کوئی
 ایسی بات نہ کی تھی۔ جس سے اندازہ ہو کہ وہ ایک دوسرے
 کو چاہتے تھے۔

چھوٹے بھیا حسب عادت جب موڈ میں ہوتے
 تو گلابہ کا بڑا سا پھول لاتے اور ناصرہ کے بالوں میں
 لگا دیتے۔ آبا بھائی جان یا کسی دوسرے کو اس کی خبر نہ تھی
 اور نہ کسی کو اتنی فرصت تھی کہ ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات
 پر نظر رکھتے۔ وہ صبح کام پر جاتے اور دوپہر کے بعد لوٹتے۔ کھانا
 کھا کر ذرا آرام کرتے اور پھر دوکان سے ملنے نکل جاتے اور پھر

سکڑا رہی ہوتی۔
 پھر ناصرہ گھر آگئی۔
 پندرہ دن بعد امتحان شروع ہو گئے۔ اس وقت تک
 ناصرہ کی ٹانگ سے پیسٹریز اتر آئے۔ مگر وہ بستر پر اٹھ بیٹھ
 سکتی تھی۔ ہم سب نے اسے محسوس نہ ہونے دیا۔ کہ وہ بیمار
 ہے۔

اور جب امتحان کا دن آن پہنچا۔ تو بھائی جان نے ناصرہ
 کو ٹانگے میں ڈالا اور سکول تک لے گئے وہاں اسے نیزی
 نگرانی میں دے دیا گیا۔ میں نے اسے سہارا دے کر کمرے
 میں پہنچایا۔ اور جب وہ پرچے دے چکی تو اسے سہارا
 دے کر ٹانگے میں ڈالا۔ اور گھر لے آئی۔

امتحان ہمیں دن رہے۔ اس دن بھائی جان نے
 مانتے پر بل ڈالے بغیر ناصرہ کی دل و جان سے خدمت
 کی۔ اور اس نے امتحان دے دیا۔

ہمارے پرچے بہت اچھے ہوئے تھے اور ہمیں پاس
 ہونے کی پوری امید تھی۔

مگر ناصرہ کے لیے جب بھی اس بارے میں
 ذکر ہوتا۔ وہ بات ٹال جاتی۔

کو مقرر ہے۔ دوسری صبح پھر سرور و فحاشیاں اسی اندازہ سے شروع
ہوتیں۔ مگر اسی نے کئی بار بیباک نامہ کے بالوں میں پھول لگاتے
دیکھا۔ ایک بار تو انہوں نے بیباک کی ماسی حرکت پر غصے کا اظہار
بھی کیا اور انہیں منع کر دیا کہ وہ آئندہ ایسی حرکت نہ کرے۔
انہوں نے وہ نظروں میں اسے اخلاقیات سے گری حرکت
قرار دیا۔ مگر پھر بیباک کو کون روک سکتا تھا۔ وہ اس کے
کچے تھے۔ انہوں نے حسب عادت اسی کی چھڑکیوں کا نوٹس
نہ لیا اور اپنے کام میں کبھی کسی کی دلی آزمائش کو رکھنا
نہ پختہ دیا۔ مگر نامہ تو لڑکی تھی اور وہ بھی مشرقی لڑکیوں کا
اندازہ تھا۔ مگر بچپن میں ایک ساتھ کھیلے اور ایک ساتھ
ایک گھر میں پلے ہوئے اور پڑھے جو بچپن میں جبکہ وہ
آپس میں حقیقی بہن بن جاتی تھیں۔ ایک دوسرے کے
لئے پیار و غلامی کا ہونا۔ ایک دوسری بات تھی۔ وہ بھی
محسوس کرتی کہ اسے بھینسا ہے۔ نفس ہے۔ اسے بیباک اچھے لگتے
ہیں۔ اور ان سے اکیلے میں باتیں کرتے ان کے ساتھ سے
انے سر میں پھول لگوانے اور ان کے کام کرنے میں شامز
آنا۔ مگر ابھی اس کی عمر یہ کیا تھی۔ وہ نہ سوچ سکتی۔۔۔ کہ
ایسا کیوں محسوس کرتی ہے۔ اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ پیار
کیا ہوتا ہے؟ اور کیوں اور کیسے ہو جاتا ہے؟

پھر اس نے فطری بھی کبھی نہ دیکھی تھیں۔ حتیٰ کہ وہ اثراتی اور یہ
سب باتیں اسے غلوں کی زبانی سمجھایا۔ وہ جانتا تھا
استان سے فراغت کے بعد اکثر چھٹی اور نہ صرف مختلف
کھیلوں کھیلنے تکیرم لڑکوں کے علاوہ جسے مل کر نہیں اس میں شامل
تھا۔ مگر ہم صرف عموں کو مل کر نہ تھیں۔ سہتہ انہیں مل کر کے
کبھی محلوں کے دفتر میں نہ بیٹھتے۔ بلکہ انکی بڑے صوبہ میں مل جیتا۔
تو اس سے اپنے حلوں کا موازنہ کر کے اپنی کاسیاتی اور ناگاہی
کا اندازہ لگاتے۔ بہر حال یہ بھی ایک کھیل تھا۔

اسی عمارتوں گھر سے باہر رہتیں۔ درزی و دھوئی سٹار
بازار نہ جانے کسی گھر سے واسطہ ہوتا۔ اور وہ دن بھر بیزار
کرتیں۔ اور بازاروں کے چکر لگاتیں۔ شادی پرانے کے سلسلوں
میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ اور ہم دونوں لڑکیاں گھری کام کا
کرتیں۔ لکھا پلائی صفا کرتیں اور جلدی ان کاموں سے
فارع ہو کر تو ہم پر دگرام جانتے ہیں۔ اسے یہ دگرام
جو پڑھائی کے دوران نہیں بنائے جاسکتے۔ دوستوں کے ساتھ
یہ وغیرہ وغیرہ اور میرا سنہ سب پر دگرام بناتے تھے
مگر امتحان ختم ہوتے ہی ان کی ڈیوٹی گھر میں ہمارے پاس
رہنے کی لگ گئی۔

ابا اور عمارت عمارت دفتر چلے جاتے اسی بازار چلی

جاتی ہیں۔ یا رشتہ داروں کے گھروں میں جاتی کسی سے مسئلہ
سنارے کا کام کروانا ہوتا کوئی کرکھائی کر رہی ہوتی اور
یہ سارے کام اتنی ہی کو کرانے پر تھے۔

آخر گھر میں پہلی ارشادی کام ننگا مہونے والا
تھا۔ اگر دھوم دھام سے شادی نہ ہوتی۔ تو بقول اتنی ناک
کٹ جائے گی۔ برادری والے جینے نہ دیں گے۔

امی کہتی ہیں اپنے بیٹے کی شادی ایسی دھوم دھام
سے کروں گی۔ کہ شہر میں دھوم مچ جائے گی۔ اور لوگ ایک
عرصہ یاد کریں گے۔

ابا بے چارے بھی روز روز کے جھگڑوں سے تنگ آچکے
تھے شادی سے پہلے انہوں نے جو روپیہ جمع کر رکھا تھا۔ اس
میں سے زیادہ حصہ وہ امی کو دے چکے تھے۔ امی تھیں کہ اور
روپیہ مانگے جاتی تھیں مگر ابانے مزید کچھ دینے سے انکار کر دیا۔
انہوں نے کہا۔

”میں نے شادی کی تقریبات کھانا اور دیگر اخراجات
کے لئے جو روپیہ بچا رکھا ہے۔ اسے کسی صورت سے بھی ہنگ
سے نکلوانا کار میں جو نہیں دے چکا ہوں۔۔۔ وہ بُت
سے رملے بقول اتنی۔

”ابھی تو آدھا کام بھی پورا نہیں ہوا تھا۔“

پھر اتنی نے بھائی جان سے بھی روپیہ مانگا۔ مگر ان کے پاس
پیسے کہاں وہ تو اپنی ساری کمائی پہلے ہی اتنی کو لاک دیتے تھے۔
انہوں نے مسکرا کر جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اور چند روپے نکال
کر امی کے سامنے ڈال دیئے۔ اور امی کا قول ہے کہ بیٹوں سے
جو بھی ملے لو۔ اور انہوں نے وہی روپے جو شاید تین یا
چار تھے اٹھا کر دوپٹے کے پورے باندھ لئے۔ اور بھائی جان
مسکراتے رہے۔

وہ اتنی کی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھے۔
اور میرامی کے لئے اخراجات پورے کرنے کا واحد ذریعہ
ادھار تھا۔ چنانچہ اتنی نے ادھار لے لیا۔ جس سے بھی مل
سکا۔ وہ ہر روز ابا کو بتاتی۔

”آج فلاں کی ماں سے یا فلاں کو بیوی سے اتنے
روپے ادھار لئے ہیں۔ لکھ لینا۔ شادی کے بعد دے دیں گے۔“
اور آبا بے چارے خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتے۔ ایک روز
ابانے کہا۔

”وہ سیم کی ماں۔ آخر یہ جو اتنا ادھار لے رہا ہو۔
دائیں بھی کرنا ہوگا۔ یہ کہاں سے واپس کریں گے۔ بہتر ہے
کہ چادر دیکھ کر چادریں لائے جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہم لوگ
قرض کے بار تیلے وب جائیں اور قرض ادا نہ ہو سکے؟“

اتنی یہ باتیں سننے کے لئے تیار نہ تھیں لڑنے کے لئے
تیار نہ تھیں۔ چل کر بولیں۔ تو لا کر دنا پیسے ہی کہاں سے لاؤں؟
"میں نے کہا کہ چادر دیکھ کر پاؤں پیارو! ابانے کہا، اتنا خرچہ
کیوں کر نہ ہی چور جنتی ہماری حیثیت نہیں ہے۔
"آپ کی حیثیت کو کیا کروں؟" اسی جیل کر بولیں۔ پچیس پچیس
انگٹھا رکھا۔ اور اب بچے کی شادی کر دی جاوے۔ تو کیا آپ کی عزت
کے سامنے ہمارے ارمانوں اور اپنے بیٹے کی خواہشات کا کھانا گھر
دون؟
اُرد بھراتی رہتا شروع کرتیں۔ کہنا معلوم کو سادقت
فقہا۔ جب وہ اس گھر میں آئی تھیں۔
یہ حربہ بابا کے لئے سب سے زیادہ کارگر ثابت ہوا۔ اور وہ
سبے چارے ہار مان لیتے، وہ اتنا کہہ رہے تھے کہ براہ راست بہت
مگر بھائی جان اور گھر کے دوسرے لوگ اس کی بالکل پرواہ
نہ کرتے تھے۔ ایسے موقعوں پر بھائی جان اچھٹ کر باہر چلے
جاتے۔ تاکہ ان پر کوئی ذمہ داری نہ ٹھونس دی جائے، مگر ساری
ذمہ داریاں تو امتی نے آپنے سسر رکھیں تھیں۔
اور چھوٹے بھتیجے چارے ان ہی ذمہ داریوں کی
صہیت چھڑھ گئے۔ دن میں کوئی بار ان کے دوست آتے
اور ان کو پکارتے۔ مگر وہ ہم سے کہلو ا دیتے کہ وہ گھر پر نہیں ہیں۔

اور وہ یہ چارے واپس چلے جاتے۔
میں نے ٹھہر کر دیکھا کہ وہ جب تک گھر میں رہتے ہیں۔ تو
کیلے میں ناہرہ سے نہ جاتے کیا باتیں کرتے ہیں اور وہ ہنس
ہنس کر لوٹا پوٹا ہو جاتی ہیں۔ وہ بھڑکے پاس بہت
خوش رہتی تھی۔ میں نے کئی بار چھپ کر ان کی باتیں سننے
کی کوشش کی۔ مگر کام نہ رہا۔

مٹی بھی بڑی ہو گئی تھی۔ اس کی عمر سات آٹھ سال سے
زیادہ ہو گئی تھی۔ بھگت وہ سکول جانے لگی تھی سارا دن وہ سکول
میں رہتی ورنہ اس کی موجودگی میں کچھ رونق ہو جاتی تھی۔
آخر خدا خدا کر کے شادی کا دن میں آن پہنچا ہم سب نے
بڑے چارے سے بھائی جان کو دولہا بنایا۔ اور پھر بڑی
شان و شوکت سے ایک چاند سی بھابی عیان گھر لے آئے۔
اس روز ناصرہ کتنی خوش تھی۔ مگر اسی جان نے اسے
مہر و نرنگا کر دیا۔ کہ وہ چند منٹ بھی بھابی جان اور بھتیجے کے
پاس نہ بیٹھ سکے۔ یوں تو سب ہی خوش تھے۔ مگر ناصرہ کی
خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اس نے پیشانی پر بن ڈالے
بغیر سروسہ کام کیا۔ جس کے لئے اسے اتنی سے کہا۔

اور بھائی جان بھی شادی کے دن کا نہ ہو گیا
ناصرہ کو بھول گئے اور چہرہ زنجی ٹوپی دلہن کی موجودگی میں

ناصرہ کو بھول جانا ایک فطری بات تھی۔ مگر اگلے روز دعوتِ ولیمہ تھی

اور بھائی جان کو یاد آگیا کہ انہوں نے دہن سے ناصرہ کا تعارف تو کر دیا ہی نہیں۔

چنانچہ وہ ناصرہ کو اپنے گھر کے میں لے گئے۔ بھائی سمٹی سمٹی بیٹھیں۔ انہوں نے بھائی جان کو دیکھ کر تقریریں جھجکا لیں۔ بھائی جان نے ناصرہ کو اس کے قریب بٹھا دیا اور بولے۔

”فریڈ کا“

”جسم“ بھائی نے آہستہ سے کہا۔

”یہ میری بیٹی ناصرہ ہے ان سے ملو بھائی جان نے کہا بھائی ایک دم چونک پڑی۔ اور گھبرا کر انہوں نے بھائی جان کی طرف دیکھا۔ اور پھر سنا صہسکا پر۔ تقریریں جمادیں بھائی جان بھائی کا اضطراب خوب جانتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے کہا۔

”اسے میں نے بیٹی بنایا ہوا ہے۔ اور سچ پوچھو تو میں نے ہی اسے پالا ہے۔ اب مجھے ان سے بچوں سے زیادہ پیار ہے۔ تم بھی اسے اپنی بیٹی خیال کرو۔“

”جسم“ بہتر بھائی نے بات سمجھتے ہوئے جواب دیا۔

”بھائی جان نے پھر کہا۔ گو بظاہر یہ بات عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔ کہ تم جیسی کم سن لڑکی سے کہا جائے کہ ایک ایسی لڑکی کو اپنی بیٹی بنالے جو جوانی میں قدم رکھ رہی ہے۔ مگر اس کا احساسِ عروسی دور کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اور ہاں۔ خدا تعالیٰ کا میں تو یہی فرمان ہے۔ اس کے حقیقی ماں باپ مرچکے ہیں۔ اور اب ہم ہی اس کے ماں باپ ہیں۔ جسم! فریڈ نے اسی قدر کہا۔

”اکی کا ناصرہ سے سلوک بہتر نہیں ہے بھائی جان نے کہا۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ اس کمی کو تم پورا کرو۔ مجھ سے زیادہ اس کا خیال رکھو۔ تاکہ اس معصوم کا دل نہ دکھ جائے۔ کوشش کروں گی۔“

بھائی نے جواب دیا۔

اور ناصرہ کے سر پر لمعہ رکھ دیا۔ بھائی جان نے پرسکون سانس لیا۔ اور مسکراتے ہوئے۔ باہر نکل گئے بھائی پوچھا۔

”کونسی جماعت میں پڑھتی ہو؟“

”دسویں کا امتحان دیا ہے۔“ ناصرہ نے جھجکا کر کہا۔

”ماشاء اللہ“ بھائی نے ہرگزوں کے سے انداز میں کہا۔ ناصرہ کو ایک اسی مل گئی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اتنی سے زیادہ

بہن معلوم ہوتی تھی۔ مگر وہ انہیں اتنی کہہ کر دل کی بھڑاسی
تو لکال سکتی تھی۔ اسے اس نام سے تو پکار سکتی تھی جسے
کہنے کے لئے وہ مناسب دن کا انتظار کر رہی تھی۔ اور وہ
وقت آگیا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

تم کتنی اچھی ہو آتی تے
اور خود ہی شہزادہ ہر جاگہ گئی۔ جہاں شادی کے
سہنگامے زوروں پر تھے۔



جہاں جان اب زیادہ وقتیں جہاں کے ساتھ گزارنے لگے۔
اور یہ فطری بات تھی۔ نئی شادی کا چاند کبھی نہیں جوتا۔ اب ان کی
معروفیات بھی اسی قسم کی ہوتی۔ جس میں جہاں کو بھی داخل جوتا
کبھی وہ میر کے لئے کسی پارک میں نکل جاتے اور کبھی پکنک منانے
چلے جاتے۔ کبھی وہ دریا پر جا کر کشتی رانی کرتے اور کبھی شام کے
وقت فلم سٹو دیکھتے۔

گو پرانے خیالات کی اتنی فلم دیکھنے والی ہو کر پسند نہ کرتی
تھیں۔ مگر جہاں کی خواہشات کے سامنے ہر ان جاننا اتنی کی
مزدوری تھی۔ جیب میں جہاں اتنی سے فلم جانے کو کہتے تو اتنی

کچھ دیکھ کر اجازت دے دیتیں۔

اسی دوران میں ناصرہ نے فلم دیکھی۔ یہ فلم اس نے پہلی بار دیکھی۔ بھائی جان اور بھابی جیب فلم دیکھ کر واپس لوٹے تو ناصرہ ان کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے کھانا گرم کیا۔ اور انہیں کھلا دیا۔ بھابی نے کھانا برا مزہ آیا۔ مسلم بہت شائدگار تھی۔

اور ناصرہ خاموشی سے ان کی باتیں سنتی رہی۔ اس نے اب تک کوئی فلم نہ دیکھی تھی۔ بھابی نے پوچھا۔

ناصرہ تو نے کون کون سی فلمیں دیکھی ہیں۔؟

جیسے ناصرہ نے گھبرا کر بھائی جان کی طرف دیکھا۔ میں تو فلمیں نہیں دیکھتی۔ اور دیکھوں بھی تو کس کے ساتھ؟ کیوں جھجھ؟ بھابی نے بھائی جان کو مخاطب کیا۔ آپ اس ترکی کے دور میں لو کیوں کو تہذیب سے دور کیوں رکھتے

ہیں؟

کیا مطلب؟ بھابی جان نے پوچھا۔ فلم کا تہذیب سے کیا تعلق؟ مگر بھائی تہذیب کچھ اور اسی نوعیت کے الفاظ کے مطلب سے بے خبر تھیں۔ انہوں نے تو اپنی قابلیت کے مطلب سے۔ بے خبر تھیں۔ انہوں نے تو اپنی قابلیت جتانے کے لئے یہ الفاظ ادا کر دیے تھے۔

میرا مطلب یہ ہے۔ کہ ناصرہ کو بھی فلم دکھائیں نا۔ بھابی نے کہا۔ ہم جیب بھر فلم دیکھنے جائیں گے۔ تو ناصرہ کو مسامحہ لے جائیں گے۔

بھابی جان نے ناصرہ کی طرف دیکھا۔ اور اس کی آنکھوں کی چمک سے اندازہ لگایا کہ اسے فلم دیکھنے کی آرزو ضرور ہے۔ بھابی نے پھر کہا۔

ناصرہ۔ اس بار تم تیار رہنا میں اتنی سے اجازت لے لوں گی۔ کیوں جی آپ کوئی اعتراض ہے۔؟

انہوں نے بھابی جان کو مخاطب کیا۔

نہیں تو بھابی جان نے کہا۔ مجھے کیا اعتراض مشوق سے سامنے لے جانا۔ لو کیوں کو چھٹیاں ہیں۔ ان دنوں یہ بھی تفریح کریں گی۔ رضیہ کو بھی لے جائیں گے۔ مگر اسی سے اجازت لینا تمہارا کام ہے۔ میں اجازت لے لوں گی۔

چنانچہ اسی انوار کو فلم کا خصوصی پروگرام بنایا گیا۔ رضیہ اور ناصرہ نے دن گزر گئے۔ وقت گزرا اور پھر انوار کے روز جب ابابھی گھر پر تھے۔ بھابی بڑے پیار سے اسی کے پاس گئیں۔ امی ابھی تک بھابی سے بہت پیار کرتی تھیں۔ اور ان کی بات اکثر جان بیا کرتی تھیں۔

ساساں ہو کا سلوک ابتدائی دنوں میں اچھا ہی ہوتا

بھابی نہ کہا۔

ان جان ایک بات کہو نہ؟

”کہو بیٹی۔ اسی نے بیار سے کہا کیا بات ہے۔ بیکے جانے کو دل پاستا ہو گا۔“ اُنسی اتنی جان بھابی نہ کہا۔ ایک اور بات ہے۔ وعدہ کیجئے آپ راجو سے نہیں کریں گی۔“

بھابی بتا بھی نہ اتنی نے کہا۔ ماننے والی بات سہلا کیوں نہ مانوں گی؟ تم کہو تو سہی آخر نہ کہا جاسیے؟
”آج ہم فلم دیکھنے جا رہے ہیں“ بھابی نے یوں کہا۔
ایسا فیصلہ سنا رہی ہوں۔

”تو شوق سے جاؤ؟ اسی کا موڈ بدلی گیا؟ میں نے دھلی ہی دینا چھوڑ دیا ہے۔ مگر ان کا اور میرا خیال ہے۔ کہ رمنیہ اور ناصر کو بھی چھٹیاں ہیں۔ اگر وہ بھی ساتھ چلیں۔ تو تقریب بھی ہو جائے گی۔ اور مزاحیہ آجائے گا۔“

بھابی کہہ جا رہی تھیں۔

ابا کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر بولے۔

”سے جاؤ بیٹی پھر رات کو شو مت دیکھنا۔ دن دن میں واپس آ جانا۔“ بھابی نے اچھا۔ بھابی کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا اور وہ تیری سے باہر نکلی گئیں۔

”آپ کو آجکل کے زمانے کے بچپن معلوم نہیں ہیں۔ اتنی نے چلا کر کہا۔“

”میں جوان مرکیوں کو فلم دیکھنے نہ جاسے دوں گی۔ میں نے ان کی مثالیں بھی کرنی ہیں۔ گھر میں نہیں بیٹھائے رکھا۔ سب مشال دے سنیں گے تو کی کہیں گے۔ پہلے بھی کبھی شادی کے بعد فلم دیکھی تھی۔ جو۔“

”تو اس کا بدلہ ادا دے کو“ ابا نے بھی سختی سے کہا۔

”وہ وقت اور تھا۔ یہ وقت اور ہے۔ ادا دہ پر زیادہ پابندی لگاؤ گی۔ تو خود بیچتا نا پڑے گا۔ میں آخر باپ ہوں۔ اپنی اولاد کا بڑا عہدہ مجھے معلوم ہے۔ تم جاؤ اپنا کام کرو۔“

”خدا کرے میں ہی اس گھر میں نہ رہوں۔ اتنی رونے لگیں اور بڑا قی ہوئی۔ باورچی خانے میں چلی گئیں۔

ابا نے خلافت مہول ان کے رونے وغیرہ کا کوئی اثر نہ لیا۔ اور اطمینان سے براہِ سرے میں لیٹ کر اخبار پڑھنے لگے۔ ناصر اور میں نے بھابی اور بھابی جان کے ساتھ بڑے زور شور سے فلم دیکھی۔

اور عید کا فلموں کا مرفوض ہوتا ہے۔ اس فلم کا موضوع عجم عشق تھا۔ ایک فرط کے اور لڑکی کا پیار اور پیران کی جدائی لڑکی کی رشتہ کی دو سرے نوجوان سے ہو گئی۔ اور دونوں نے اکٹھے زہر کھا لیا۔ اور دوسرے جہان میں جا ملے۔

اس وقت ناصر کو معلوم ہوا کہ پیار کیا ہوتا ہے؟ وہ

وہ گھر آئی۔ اسی شام کو اس نے بھیا کو ظلم کی ماری کھائی
سنائی خاص خاص موقوفوں پر اس کے پہرے پر مخرجی
دوڑائی اور آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ بھیا بھی سہ اس موقع
پر جب لڑکا لڑکی سے پیار کی باتیں کرتا ہے۔ تو سن کر پہلو
بدلتے رہے۔

اس وقت نامرہ نے محسوس کیا کہ انہیں بھیا سے وہی
ہے۔ وہ فلم والی لڑکی کو لڑکے سے بڑا تھا۔
مگر دونوں میں کسی نے بھی اس کا اظہار حقیقت سے الفاظ
میں بھی نہ کیا۔ مگر جہاں دلوں سے دل مل جائیں۔ وہاں
زبان کو کوئی بات کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔



امتیاز کا نتیجہ نکلا آیا۔ ہم سب پاس ہو گئے تھے۔
مگر نامرہ نے سنسٹ ڈویژن میں نے سیکنڈ ڈویژن اور چھوٹے
بھیا نے تھرڈ ڈویژن لی تھی۔ اس طرح نامرہ ہم سب پر
بازی لے گئی تھی۔

گھر میں ایک بار پھر خوشیوں کا میلہ با امیڈ پڑا۔ میں
نے اور بھیا نے اپنے اپنے پاس ہونے کی خوشی میں بھی
کو مٹھائی کھائی۔ امی نے ہمیں اس موقع پر بہاری خواہش
کے مطابق پیسے دے دیئے تھے۔ مگر نامرہ کس سے پیسے

یعنی وہ احساسی ہو گئی اور تم میں اپنے کمرے میں جا بیٹھی۔ میں نے نامرہ کی طبیعت کا پتہ لیا اور اسے تسکین دینے کے لئے اس کے کمرے میں پہنچا۔

”اے یہ کیا ہے؟ میں حیران رہ گئی۔

نامرہ رو رہی تھی۔

”کیا ہوا نامرہ؟ میں نے پوچھا۔

”مگر وہ خاموش رہی۔ اس کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو بہنے لگے۔

”چھوٹے بھیا بھی کمرے میں آگئے۔ اور انہوں نے بھی نامرہ کو روتے دیکھ کر ہمدردی کا اظہار کیا۔ ہم دونوں اس سے روتے کی وجہ پوچھ کر تنگ آ گئے۔ مگر نامرہ نے کچھ بھگتا نہ بتایا وہ سر جھکا کر آنسو بہاتی رہی۔ آخر بھیا کو غصہ آ گیا۔ انہوں نے کہا۔

”بھیا بہتیں قسم ہے۔ اگر اب بھی خاموش رہو۔ ہماری قسم اگر تم نے اب بھی نہیں کچھ نہ بتایا تو ہم تم سے تہ بولیں گے۔“

خاصہ نے چہرہ اوپر اٹھایا۔

”اے وہ روتے وقت بھی کتنی خوبصورت لگ رہی تھی اس کی موٹی موٹی غزالی آنکھیں اور کاسے جھنورے سے ابزد تو مجھے پہلے ہی سے پسند تھے۔“

مجھے نامرہ پر بے حد پیار آ گیا مگر اس پیار میں ہمدردی کا جذبہ غالب تھا نامرہ نے کہا۔

”مجھے اسی یاد آ رہی تھیں۔“

”تو جاؤ نہ جا کر مل لو“ بھیا نے جلدی سے کہا۔

”مگر میں خاموش رہی نامرہ نے ایک بار چہرہ اٹھایا اور بھیا کی طرف دیکھ کر کہا۔

”اپنی امی۔۔۔۔۔“

وہ اس سے آگے کچھ نہ بولی۔

”مگر کیوں نامرہ؟“ بھیا بولے ”اس میں روتے روتے کی کوئی بات ہے جی خاموش رہو نا۔“

بھیا کی آواز بھی بھراؤنی نہ تھی میں نے غصہ کیا جیسے نامرہ اگر جلدی چپ نہ ہوئی تو بھیا بھی رو دیں گے۔

”دیکھئے نا“ وہ بولی ”آپ لوگوں کی امی نے آپ کے پاس ہونے پر آپ سب کو پیار کیا۔ پیسے دئے اور۔۔۔“

وہ جھکیاں لینے لگی۔ جبر بولی۔

”اگر آج میری امی بھی زندہ ہوتیں تو مجھے پیار کرتیں شاہناش دیتیں اور مٹھائی کھلاتیں۔“

”اے کھلائے دیتے ہیں“ بھیا بولے۔ ”ہیں۔۔۔ نامرہ نے جواب دیا ”مگر کیوں تم تمہارے کچھ نہیں گتے؟“ بھیا نے پوچھا۔

”میں نے کب کہا ہے چنانچہ نے جواب دیا یہ تو حرف ماں باپ کی یاد ہے اور مل باپ کا بدلہ لونا میں وہ سراپکے جو سکتا ہے؟“
 ہم دونوں حرف ایک لمبی ساری سانس لے کر رہ گئے۔ والدین سے جھڑپوں نے یاد کو تو وہی جان سکتا ہے جس نے یہ زخم پر حاشت کیا جو دوسرا اس کا درد کیا جانے۔ اتنے میں بھائی جان بھی آگئے۔ ہم سب اداس بیٹھے تھے۔ اور نامرہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ نامرہ نے جلدی سے آنکھیں صاف کیں اور سر پرودہ درست کیا۔
 بھائی جان نے ہمیں ہلکسا اور نامرہ کو روتے دیکھا تو گھبرا گئے یہ تو ان کی علوت تھی راہتوں نے نزدیک آکر آہستہ سے پوچھا۔
 ”کیوں کیا ہوا؟“

انہوں نے نامرہ کو مخاطب کرنے سے پہلے مجھ سے بات کی یہ نامرہ رو رہی ہے۔ میں نے جواب دیا۔
 ”مگر کیوں؟“ بھائی جان نے سوال کیا۔
 ”یہ کبھی ہے کہ اگر میری امی زندہ ہوتی تو آج مجھے انسا ہوتی پیار کرتی اور مٹھائی کھلاتی“
 میں نے جواب دیا۔

بھائی جان خاموش ہو گئے پھر انہوں نے نامرہ کو بازو سے پکڑ کر اٹھا لیا۔ اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
 ”تم ہماری بیٹی نہیں ہو نامرہ؟“

جی وہ تو بونہی امی کی یاد آگئی تھی درنہ.....
 نامرہ نے کہا اور وہ کوئی معقول بہانہ نہ بنا سکی۔
 بھائی جان نے حیرت سے سر روپے کا نوٹ نکالا اور نامرہ کے ہاتھ میں دے کر کہا۔

یقین کرنا یہ میں تمہارے آنسو پونچھنے کے لئے نہیں دے رہا بلکہ یہ میں نے تمہیں دینا ہی تھا۔ مگر آنسو مجھے صبح یاد نہ رہا ابھی ابھی میں نے بٹوے سے نکالی کر حیرت میں کھلا ڈال لیا تھا۔ تاکہ آتے ہی تمہیں انعام ملے۔
 نامرہ نے کہا۔

”مگر میں نے یہ نہیں مانگا“

”اں۔ تم نے یہ نہیں مانگا“ بھائی جان نے کہا۔
 ”مگر تمہارا انعام ضرور ہے۔ اور تمہیں لینا ہو گا۔“
 اتنے میں باہر سے بھائی آگئے۔ وہ ابھی ابھی بھائی جان کے ساتھ شاپنگ کر کے لوٹی تھیں۔
 انہوں نے سب کو کھڑے دیکھا۔ تو یک دم چڑک پڑیں۔

آدرا بولیں۔

”اوسے یہ کیا تم لوگ یوں کیوں کھڑے ہو۔“
 پھر انہوں نے نامرہ کی سرخ آنکھیں دیکھ کر پوچھا۔

اور اپنے ہاتھ پر باندھنے لگی۔ پھر اچانک بیوی -
”کتنے میں آئی ہے۔“

”چار سو روپے میں“ بھابی نے جواب دیا۔
”آپ نے اتنے روپے خرچ کو دیئے مود خاموش سی ہو گئی۔
”ایسی ناراضی ہوں گی۔“

”کیوں امی کیوں ناراضی ہوں گی کچھ بھابی جان نے کہا
”صدا سے تھوڑے لئے ہیں۔ یہ پیسے۔“
”مگر نامرہ نے کہا۔ اور کچھ کہتے کہتے رک گئی اور بھابی نے
اسے پیار کیا۔ اور۔۔۔ سینے سے لگا لیا۔
نامرہ کے ہاتھ پر چمکدار نئی گھڑی کتنی پیاری لگتی تھی۔
میں نے سوچا کاش آج نامرہ کی جگہ میں ہوتی۔
پھر بھابی نے مجھ سے کہا۔

”امی رضیہ تم کیوں چپ چپ سی ہو میں تمہارے لئے خوبصورت
سی ساڑھی لائی ہوں۔“
”مگر اسے باندھنے کا کون۔“
”جیسا بول اٹھے۔“

”باندھنا میں آجائے گا۔“ بھابی نے کہا۔ اور تمہارے لئے بھی
تمہارے پاس ہونے کی خوشی میں سوٹ کا پیراؤ لٹاؤ میں دیا
جائے گا۔“

”تم رونی ہو نامرہ۔“
میں نے جواب دیا۔

”یاں۔“ بھابی جان نے جواب دیا۔۔۔۔۔
”مگر کیوں؟“ بھابی حیران رہ گئیں۔ ”ارے یہ تو خوشی کا موقع
تھا۔ تم رو کیوں پڑھیں۔“

”نامرہ کو اپنی امی یاد آگئی تھیں۔“ بھابی نے کہا۔
”ارے ہلکی“ بھابی نے جواب دیا۔ ”کیسے جانے والے بھی
لوٹ کر آیا کرتے ہیں۔ تم کیوں اپنی جان ہلکان کرتی ہو ہم جو تیرے
میں تمہیں کسی چیز کی کمی ہے۔ کیا؟“
”جی بس یونہی۔۔۔۔۔“ نامرہ نے کہا۔
اور بھابی نے اسے گلے لگا لیا۔

پھر بھابی بولیں
”میں تمہارے لئے تمہارے پاس ہونے کی خوشی میں ایک انعام
لائی ہوں دیکھو گی۔“

”کیوں نہیں دیکھوں گی؟“ نامرہ ایک دم خوش ہو گئی
پھر بھابی نے ایک سنہری چھوٹا سا کبس نکالا اور اسے کھول کر ایک
چمکتی ہوئی خوبصورت گھڑی نامرہ کے سامنے کر دی
”کیسی ہے“ بھابی نے پوچھا۔

”امی اشد کتنی پیاری ہے“ نامرہ نے خوشی میں گھڑی چھو لی۔

بہر حال ہم سب کو گھر وادوں نے انعام دیا۔ بھائی جان ہی تو سب
میں بڑے تھے۔ ابا جان ان باتوں میں دلچسپی نہ لیتے تھے۔
بلکہ شادی کے بعد انہوں نے یہ ساری باتیں بھائی جان کے
سپر دکردی تھیں اور انہوں نے ابا جان کی جگہ ہمیں انعامات
سے نوازا تھا۔

پھر بھائی جان نے کہا۔

”ہاں بھو۔ ایک اور خوشخبری سنو“

”فسر رائے“ بھیا بھدی سے ملے۔

پارسموں ہماری نافرہ کی ساگرہ ہے۔ میرا خیالی ہے اس بار دو
خوشیاں ایک ساتھ آئی ہیں۔ تم سب کے پاس ہونے کی خوشی
اور نافرہ کی ساگرہ۔“

گھر میں پہلی بار ایک انوکھا اجتماع ہوا۔ بھیا نافرہ اور
میرے سبھی واقف کا جمع تھے۔ جو پارٹی میں شریک ہوئے تھے
دوستوں نے بھی پارٹی میں شرکت کی اور ہماری سہیلیوں نے بھی
اور سبھی نے بہن بھائیوں کی طرح خوش گیلیوں میں دولت کا آغاز
کیا۔ بھائی جان نے اعلان کیا۔
”کہ انہوں نے نافرہ کو اسلئے تعلیم دلوانے کا فیصلہ کر
لیا ہے۔“

اس کے بعد اجتماع میں مجھے اور بھیا کو اعلیٰ تعلیم کے
سلسلے میں خود اعلان کرنا پڑا۔

اس موقع پر ہم نے محسوس کیا کہ گھر واسے ہماری

موجودگی میں ہمیں کم اہمیت دے رہے ہیں اور نامرہ کو زیادہ اہمیت دی جا رہی ہے۔ اور یہ بات ہمیں بہت بڑی لگی۔ کچھ دیر کے لئے تو دل میں نامرہ کے لئے نفرت کے جذبات پیدا ہو گئے آخر وہ ہی تو وجہ ہے۔ اس کی کوکھ گھر دے اس کی موجودگی میں ہمیں کم اہمیت دیتے تھے اور یہ سب بھائی جان کی وجہ سے تھا۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ بھیا اس کا کچھ زیادہ بڑا نہیں مٹا رہے۔ نہ جانے کیوں۔ جب بھی نامرہ کو کوکھ کی جگہ ملتی وہ خاموش ہو جاتے اور نامرہ کی تعریف کرتے۔

اس موقع پر انہوں نے تعریف کی نامرہ کی اور کہا "نامرہ دراصل بہت ذہین اور اچھی لڑکی ہے۔"

"اس نے بہت کم عرصہ میں بہت زیادہ پڑھ کر ہم سب کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔"

نامرہ مسکرا دی۔

بھیا پھر بولے۔

"بھائی جان اب اسے کون سے مضمون دلا دیے گا؟"

"بھئی جو نامرہ جو چاہے گی۔ بھلا اس میں میری مرضی کو کیا

داخل ہے؟"

بھائی جان نے کہا۔

"کیوں نامرہ؟" بھیا نے پوچھا۔

"میں کون سے مضمون لوں گی۔" نامرہ نے سوچتے ہوئے کہا پھر آہستہ سے بولی۔

"جو آپ پسند کریں۔"

بھیا کے چہرے پر خوشی اور فخر کے جذبات پیدا ہوئے

وہ بولے "جو میں چاہوں گا وہ ہو گا۔"

غور ہو گا۔" نامرہ نے آہستہ سے کہا۔

"وعدہ۔" بھیا بولے۔

"وعدہ۔" نامرہ نے اپنا خوبصورت ہاتھ بھیا کے ہاتھ پر رکھا

کہہ کہا "کیا راز دینا نہ ہو رہے ہیں؟"

ایک مہمان نے کہا۔

"میں نامرہ سے پوچھ رہا تھا کہ وہ کیا بنا چاہتی ہے۔" بھیا نے

کہا "تو کیا جواب دیا۔"

سبھی نے جلدی سے پوچھا۔

"لیڈی ڈاکٹر۔" بھیا نے جواب دیا

اور سبھی کے چہروں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

نامرہ تو بہت ہی خوش ہوئی اس نے آہستہ سے کہا۔

"آپ نے تو میرے منہ کی بات نہیں لی۔"

سلیم بھیا بولے۔ "واقعی؟"

"ہاں" نامرہ نے شونہی سے جواب دیا۔

آج وہ بہت مسرور دکھائی دے رہی تھی اور شوخ لباس میں کتنی خوبصورت لگ رہی تھی۔

بھینا اور نامرہ پاس پاس کھڑے تھے اور جب نامرہ نے چائے کی ایک اور پیالی بنا کر بھینا کی آنکھوں میں بھانک کر پیالی پیش کی تو میں نے دل میں سوچا۔۔۔ ان دونوں کی جوڑی کتنی جگے لگی۔ نامرہ کو میری بھابی بننا چاہیے۔ اور میں نے آہستہ سے زیر لب کہا۔

”نامرہ بھابی“

”کیا خود سے باتیں کر رہی ہو“ میرے پاس کھڑی ہوئی ایک سہیلی نے کہا۔

”کچھ نہیں“

”ہوں کچھ تو ہے“ وہ شوخی سے بولی۔

میں نے غصے سے کہا۔ جیسے وہ یہ شوخ رہی ہو کہ میں نے پارٹی میں موجود کسی لڑکے کو پسند کر لیا ہے۔

اور اسے بلا رہی ہوں۔

”اوئی اللہ کہتے شرم کی بات ہے“

میں نے خود سے کہا۔

اور پھر میں نے ایک بہانہ بنا لیا۔

”نسرین“ میں نے کہا۔

”کیا ہے کہے پسند کر لیا ہے۔ میری سہیلی نے؟“
نسرین نے میری تہنق کے مطابق کہہ دیا اور میں شرم سے پانی پانی ہو گئی۔

”چل بٹ بڑی آئی ایسے مذاق کرنے والی میں کیوں پسند کرنے لگی۔ کسی کو چہرہ آوارہ ہوئی کوئی؟“

”تو کیا۔۔۔۔۔“ وہ کچھ کہتے بکتے رک گئی۔ اور پھر سنجیدہ ہو کر بولی۔ ”تو کیا بات ہے؟“

”میں سوچ رہی ہوں نامرہ کو کیا تحفہ دوں میں نے کہا۔“
”کس بات کا؟“ وہ بولی۔

”اس کے پاس ہونے کا“ میں نے جواب دیا۔

”اس نے تمہیں کیا دیا ہے؟“ نسرین نے سوال کیا۔

”کچھ نہیں“ میں نے کہا۔

”تو تم کیوں دو گی؟“ وہ بولی۔

”یہ ضروری نہیں کہ وہ دے تو میں اس کے بدلہ میں اسے دوں۔“

پھر سالی میں اسے کچھ دینا چاہتی ہوں۔“

میں جواب دیا۔

”تو ضرور دے“ وہ بولی۔

”مگر کیا دوں۔ یہ تو بڑا تھکا ہے۔“ میں نے کہا۔

پھر ایک دم میرے ذہن میں ایک خیال آ گیا۔ میں اٹھ کر

نامرہ کے پاس گئی اور کہا۔
"نامرہ"

"جی" وہ چونک کر بولی۔

"میں تمہیں تمہارے پاس ہونے کا تحفہ دینا چاہتی ہوں"
میں جواب دیتا تم انکار نہ کرنا
نامرہ خاموش رہی۔

"میں نے جلدی سے اپنے کانوں سے سونے کے بندے جو چند
ماہ پہلے ہی ابا جان نے مجھے لاکر دیے تھے۔ اتارے اور نامرہ
کے کانوں میں پہنا دیئے۔"

مگر نامرہ نے پریشان سی ہو کر کچھ کہنا چاہا۔

"ہاں یہ تحفہ ہے" میں نے جواب دیا "انکار نہ کرنا تم میری بہن نہیں
ہو کیا؟ اور میرا مرض نہیں۔ کہ میں تمہیں کچھ دے سکوں"
نامرہ خاموش سی ہو گئی اس نے ایک تسکری گھڑی پر ڈالی۔

میں نے فوراً جان لیا۔

کہ وہ گھڑی مجھے دے دینا چاہتی ہے۔

مگر گھڑی تو اسے تحفہ میں ملی ہے اور ایک غفہ وہ ایک دوسرے کو
تحفہ دے سکتی تھی۔

پھر اسے ایک دم خیال آگیا۔

ابا جان نے جب مجھے بندے لاکر دے تھے تو اسے بھی

ایک خوبصورت موتیوں کا ہار لاکر دیا تھا جس کے ساتھ سونے
کی زنجیر تھی۔

نامرہ نے وہ ہار لگے سے اتارا اور اتنے خلوص سے
میرے گلے میں ڈال دیا۔ کہ میں انکار نہ کر سکی۔
"مگر نامرہ.....! میں نے اسی قدر کہا۔

تم بھی اسے خاموشی سے قبول کر لو۔"

میں نے اس دوران بھیجا کی طرف دیکھا وہ کچھ کھوئے
پھوئے سے تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ الجھن میں گرفتار ہیں کہ وہ نامرہ کو
کیا تحفہ دیا جائے

ابا جان نے ان کو بھی چند ماہ پہلے سونے کی ایک انگوٹھی
لا کر دی تھی۔ جب ہمیں سونے کے بندے اور ہار دیا تھا۔
تو انہوں نے ابا سے جھگڑا کر لیا تھا کہ انہیں بھی کوئی زیور
دیا جائے۔

ابا نے کہا تھا۔

"کہیں لڑکے کے بھی زیور پہنا کر نہیں۔"

تو بھیانے کہا تھا۔ کہ ان کو گھڑی کا سونے کا چین ہی بنوا
دیں۔ مگر ابا نے مداخلت کر دی۔

"کیوں جی میرا بیٹا اتنا سستا ہے۔ اس کو کم از کم ایک انگوٹھی

ہی دسے دی ہوتی ۔

اور پھر اس سے پہلے کہ گھر میں اسی ہنگامہ ہو پا کر دیتیں ۔
ابا نے ہتھیا اور ڈال دسے اور بھیا کو انگوٹھی لادی ۔

گنتی خوبصورت انگوٹھی تھی ۔ اس کا رنگ لال تھا جو سماگ کا
رنگ ہے ۔ بھیا کے ہاتھ میں وہ انگوٹھی کتنی پیاری لگتی تھی ۔
اور انہیں لوں بھی یہ انگوٹھی عزیز تھی ۔

میں نے دیکھا ۔ بھیا انگوٹھی کو دائیں ہاتھ سے ڈال رہے ہیں
اور پھر انگوٹھی نے ایک شکر نامہ کا ہاتھ پکڑ لیا ۔ اور بولے
”بھئی ہم سے تمہارے نہیں لڑ گئے؟“

نامہ نے چپکے کر بھیا کو دیکھا اور بولی ۔

”مگر وہ اس سے آگے نہ بڑھ سکی۔“

بھیا نے کہا ۔

”ہم زور تھو دین گے“

اور پھر انہوں نے اپنے ہاتھ اسے انگوٹھی اتار کر نامہ کے
ہاتھ میں پہنا دی ۔

وہ اس بات سے بے خبر تھے ۔ کہ لڑکے کا لڑکی کے ہاتھ میں

انگوٹھی پہنا دینا کس بات کی دلالت کرتا ہے ۔ مگر یہ فضل لاشوئی
طوبہ پر سرزد ہو گیا تھا ۔

حامزہ نے یہ سب تماشہ دیکھا اور تالیاں بجا دیں ۔

جیسا کہ اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ۔ مگر جو پہنا تھا وہ تو بے
چمکا تھا ۔

انہیں شرمندگی ہوئی اور میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ اپنی خالی
انگلی رگڑ رہے تھے ۔

میں نے نامہ کی طرف دیکھا ۔

وہ نظریں جھٹکے ”خاموشی کھڑی تھی ۔ سرخ رنگ والی انگوٹھی
اس کے ہاتھ میں خوب چمک رہی تھی ۔

امی اس وقت دلوں میں موجود نہ تھیں ورنہ جانے کیا گل
کھلاتیں اور یہیں بے عزت ہونا پڑتا ۔

بھیا نے کہا ۔

”نامہ میں تھو نہیں دو گی ؟“

”جی“ نامہ نے بھیا کی انگوٹھیوں سے جھانک کر کہا ۔

اور پھر جلدی سے اپنا ہاتھ خود ان کے ہاتھ میں دے کر بولی
”یہ گھڑی ہی لے لو ۔ اتار لو نا“

”نہیں ہم نے لیا؟“

بھیا نے اس کے ہاتھ پر دوسرا ہاتھ پھر کر کہا ۔

ایک بار پھر سب نے تالیاں بجا دیں ۔

اور نامہ نے گھر کر ہاتھ پکڑ لیا ۔

بھائی تالیاں بجانے میں پیش پیش تھیں ۔

اور بھائی جان کسی کام سے دوسرے کمرے میں تھے ۔

یہ سب کام ان کی غیر موجودگی میں ہوا ۔

میں نے نامرہ کی طرف پھر دیکھا ۔

وہ کچھ شرمندہ شرمندہ سی تھی ۔ اور نظریں جھکائے نہ جانے کیا سوچ رہی تھی ۔

”کیا سوچ رہی ہو نامرہ؟“

میں نے اس کا چہرہ ادھر اٹھا کر پوچھا ۔

نامرہ نے میری طرف دیکھا اور مسکرا دی ۔

پھر ہم دونوں نے ایک دوسرے کو بازوؤں میں لے لیا ۔

اور بغل گیر ہو گئیں ۔

میں نے آہستہ سے نامرہ کی انگوٹھی کو چوم لیا ۔

وہ شرمائی اور مجھ سے ہاتھ چھڑا کر دوسرے کمرے میں بھاگ گئی
جس نے سوچا ۔

ابھی ابھی میں نے دل میں جو بات سوچی تھی وہ کتنی جلدی
پوری ہو گئی ۔

نامرہ دوسرے کمرے میں جا چکی تھی ۔ میں بھی دوسرے

کمرے میں گئی ۔ اور اس کے قریب جا کر آہستہ سے کہا ۔

”مبارک ہو۔“

”کس بات کی؟“ اس نے حیرانی سے کہا ۔

”بھیا نے ہاتھ میں انگوٹھی جو پہنا دی ہے میں نے کہا
”چلو شراقی کہیں کی اورہ لونی ۔“

”نامرہ بھابی“ میں نے آہستہ سے کہہ دیا ۔ میں نے

دیکھا اس کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا ۔ اور اس نے نگاہیں نیچی
کر کے انگوٹھی دوپٹے میں چھپا لی ۔ اور بول ”ایسی باتیں نہ کرو
مرغیہ باجی ہمیں شرم آتی ہے۔“

وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی اور میں نے اسے سینے سے

لگا کر کہا ۔

”ہمت اچھا نامرہ بھابی“

مگر اس نے اقرار بھی نہ کیا۔ اور انکار بھی نہیں میں اس کے قریب گئی اور اسے بازو سے پکڑ کر کسی پر نرودیک بٹھالیا۔ اور بولی
 ”دیکھو نامہ۔ کسی سے سچا پیار کرنا کوئی بڑی بات تو نہیں اور پھر تم
 ایک دوسرے کے ساتھ چلے اور جوان ہوئے ہو۔ اور اگر تمہیں
 بھیا پسند ہیں تو مجھے بتا دو۔ میں تمہاری امداد کروں گی۔“
 ”کیا امداد کریں گی آپ؟“ وہ بولی۔

”میں اسی اور ابا سے کہہ کر آپ کی شادی کروا دوں گی۔“
 میں نے جواب دیا۔

اس نے شرمناک درونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔
 اور بولی۔

”آپ آج کیسی باتیں کرتی ہیں؟ چھوڑیے مجھے شرم آتی
 ہے میں شادی نہیں کروں گی۔“

اس نے اٹھ کر جانا چاہا۔ مگر میں نے مسکرا کر اسے

پکڑ لیا اور کہا۔

”تم تو میری اچھی بہن ہو اور اگر بھابی میں جاؤ تو کتنا
 اچھا ہو۔ اس سلسلے میں اگر میں تمہاری خواہش پورا کرنے
 کا سبب بن جاؤں تو میری اس سے بڑی خوشی مستی کیا
 ہوگی۔“

”مگر رضیہ بہن“ وہ بولی ”آپ ایسی باتیں نہ کریں۔“

مجھے شرم آتی ہے۔“ ہم بیلیاں ہیں“ میں نے کہا
 ”مجھ سے نہ چھپا میں۔ بتائیں نا۔“

”کیا.....؟“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”تمہیں بھیا اچھے لگتے ہیں نا؟“ میں نے پوچھا۔

”میں کیا بتاؤں“ وہ بولی۔

”ہاں۔ یا نا.....؟“ میں نے کہا۔

وہ خاموش رہی اور زمین کو گھورتی رہی..... میں نے کہا
 ”میں کسی کو نہ بتاؤں گی۔“

”یہ میرا اور تمہارا راز ہے گا۔“

مگر وہ خاموش رہی۔

”تمہیں میری قسم۔“ میں کہا ”مزدور بنا۔“

اس نے میری طرف دیکھی اور آہستہ سے کہا۔ ”ہاں۔“

میں بھی زور سے ہنس پڑی اور نامہ نے میرے منہ پر ہاتھ

رکھ دیا۔ ”کسی سے کہنا نہیں۔“ وہ بولی۔

”میں تو مزدور ہوں گی نامہ بھیا کو.....“

میں نے زور سے کہا۔

اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

اور بولی۔

”آپ نے غلط وعدہ کیا تھا؟“

”اور ہاں ایک اور بات بتاؤ۔“
”کیا؟ وہ یوں۔“
”کبھی بھیا سے کوئی بات بھی ہوئی ہے؟“

کی بات۔۔۔
 "منہس۔۔۔۔۔" وہ بولی۔

”کیوں؟“ میں نے پوچھا۔
”ہم آوارہ مغتوری ہیں۔“ اس نے جواب

ماں باپ کی مرضی کے سامنے ہمیں.....

وہ پھر شرمائی اور اسے احساس ہو گیا کہ وہ کیا کہنے والی تھی۔

پھر وہ بولی۔

”رضیہ باجی چھوڑو اس بات کو مجھے شرافتی ہے۔“
”اور ہاں.....“

وہ پھر خاموش ہو گئی۔
 "تبادا"؟ میں نے پوچھا۔
 "وہ اس دن پاٹری کے بعد۔"

اس نے کہا۔ آپ نے مجھے پیار کیا تھا۔۔۔ اور بھابی کہا تھا۔

”ہاں کہا تھا۔“

میں نے کہا۔ کتنا پیارا نام دیا ہے۔“

”مگر آپ پھر نہ کہیے گا۔“ اس نے کہا اور نہ۔۔۔۔۔“

”ورنہ کیا؟“

میں نے کہا۔

”مجھے شرم آتی ہے آپ نہ کہا کیجئے“ اس نے کہا۔

”ایک بات بتاؤ۔ نامہ میں نے کہا۔“

”پوچھو؟“ اس نے جواب دیا۔

”تم میری بھابی بنو گی نا۔ میں نے کہا۔“

”پھر وہی باتیں۔“ اس نے اپنا منہ پھر دوپٹہ میں چھپا لیا۔

”بھئی میں جاتی ہوں۔ آپ شرمندہ کرتی ہیں۔“

”مگر تمہیں اس کا جواب دینا ہو گا۔“ میں نے کہا تمہیں اس میں کوئی

الزام ہے۔۔۔۔۔“ نہیں۔۔۔۔۔“ اس نے کہتے سے کہا اور منہ دھو

میں چھپا کر ہنسنے لگی۔“

پھر وہ ایک دم بغیر ہو گئی اور بولی۔

”مگر رینیہ باجی ایک بات ہے۔“

”کیا۔۔۔۔۔“ میں نے کہا۔

”امی جی میں کبھی خوش نہ دیکھ سکیں گی۔ وہ بولی۔“

میں نے کہا۔ آپ اُمیدوار نہیں۔ نامہ بچا بھی۔

”میں بھی چاہتی ہوں۔ کہ تمہاری خوشیوں کو حقیقت کا روپ مل سکے“

اور یقین کرو میں تمہاری ہر طرح مدد کروں گی۔

میں تمہارے راستے کی ہر پرواز کے سامنے پہاڑ بن جاؤں گی اور

تمہیں منزل تک پہنچا دوں گی۔“

”مگر امی۔۔۔۔۔“ بولی۔

”تم فکر نہ کرو اور یہ بتاؤ کہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔“

”کہا کیا؟“ وہ بولی ”مجھے نا“ وہ بے چین ہو گئی۔

وہ ایک دم مجھ سے بے تکلف ہو گئی تھی۔ میں نے کہا۔

”بھیا جی تمہیں پسند کرتے ہیں۔ نا۔“

”میں نے کہا نا کہ ان کی آنکھوں میں بھی میں نے وہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔“

”وہ کہنے لگی۔ مگر میں بات کاٹ دی۔“

”اس کا کیا ثبوت کہ وہ تم سے پیار کرتے ہیں۔؟“

میں نے کہا۔ ”وہ ہمدردی ہیں تو ہر کشتی ہے۔“

”جی اس نے جو بک کر کہا۔“

”تم نے بات ٹوکی ہوتی۔“

”جی نہیں۔“

”میں کیسے بات کروں اس نے کہا۔“

”کسی بہانے ان سے پوچھو کہ آپ مجھے پسند کرتے ہیں۔“

”نامرہ بہن مردوں کا کیا اعتبار اگر پسند کرتے ہیں تو تم سے شادی

کرنا بھی پسند کریں گے؟“

”جی میں کیا جانوں؟ اس نے نظروں جھکا کر کہا۔

وہ کسی سوئٹ میں کھوکھائی تھی۔

میں نے کہا۔

”ان سے پوچھنا چاہیے“

”مجھے میں یہ ہمت نہیں“ نامرہ نے کہا۔ ”ماں آپ پوچھ سکتی ہیں۔

مگر میری طرف سے نہیں۔“

”تو اپنی طرف سے کیا؟“ میں نے کہا۔

”یہ آپ خود کریں“ وہ بولی پھر وہ میری منت کرنے لگی میں نے کہا

”اچھا بھئی اگر ایسا سچ تو میں پوچھ لوں گی“

”کیا؟“ اس نے کہا۔

میں پوچھوں گی کہ نامرہ آپ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ آپ کو

منظور ہے؟“

”چلو ہٹو بھی مذاق نہ کرو۔“ وہ بولی ”تباکیا پوچھیں گی؟“

جو کہہ دیا وہی تمہیں نے جواب دیا۔

”نہیں بھئی۔“ نامرہ نے کہا۔

”اپنی طرف سے پوچھنا اور دیکھ کر کہ کوئی ایسی بات نہ کر دیگی کہ

جس سے ثابت ہو کہ میں نے ان کے پاس تمہارے ذریعے

پینا کر بیٹھا ہے۔“

میں نے دلائل کر لیا۔

پھر ہم دوسری باتوں میں لگ گئیں۔ سکول اور کالج کہ باتیں میں

نے کہا۔

”میں تو آرٹس کے مضامین لوں گی اور آپ سائنس کے کیوں؟“

کیوں۔ وہ بولی۔

”آپ میڈیکل جو کریں گی۔ پہلے دو سال تک تو ہم اکٹھے پڑھ سکیں

گے۔ پھر میں کالج بدلنا ہو گا۔ مگر میں اکیس کیسے کلاس میں جا سکوں

گی۔ جبکہ میں تمہارے ساتھ ایک ہی سیٹ پر بیٹھ کر کلاسی ہوں۔“

”ایک بات کہوں؟“

وہ بولی۔

”مرد نہ کہو۔“

میں نے جواب دیا۔

”تم بھی میڈیکل مضامین لے لو۔ میں نے کہا۔

”کم از کم ساتھ تو بن جائے گا۔“

”آرٹس میں کیا رکھا ہے۔ ملازمت بھی نہ ملے گی اور پھر ہم اکٹھی

کالج میں پڑھ سکیں گی۔“

”دعا کرو۔“

”مگر ابا جان مجھے میڈیکل میں پڑھانا نہیں چاہتے۔“

میں نے جواب دیا: ”وہ کہتے ہیں لوگوں کے ساتھ بڑھنا پڑے گا۔
تمہارے لئے بھی وہ اجازت نہیں دیتے تھے۔ بھائی جان نے بڑی
مشکل سے رضامند کیا ہے۔“
”یہ تو اور بھی اچھی بات ہو گی۔“ وہ بولی۔

”وہ کیسے؟“ میں نے پوچھا
”میں ان سے کہوں گی کہ میں اکیلی کالج نہیں جانا چاہتی دونوں
بچیں ہوں گی۔ تو وقت اچھا گزر جائے گا۔ اور اس طرح تمہیں ان
سے اجازت ملے گی۔“
”مگر وہ نہیں مانتیں گے اور اگر مان بھی گئے تو امی نہیں مانتیں گی؟“
میں نے جواب دیا۔

”میں اباجان سے اجازت ملے گی۔ اور امی جان سے
آپ خود اجازت ملے لیں۔“
”اور مان میں بھائی جان سے بھی کہہ کر اجازت ملے گی۔“
پھر میرا خیال ہے امی اجازت دے دیں گی، مگر ایسا ہو تو مزا
آ جائے گا۔“

میں نے کہا

”ایسا مزہ ہو گا۔“

”وہ بولی“ مزہ ہو گا۔“

پھر ہم ہنس پڑیں۔ اور ایک دوسرے کو گلے لگا لیا۔

میں ممی سے بات کرنے کے لئے کئی روز سے موقع کی تلاش میں تھی
مگر وقت نہ مل رہا تھا۔ پھر یہ شرمیلہ مٹی بھی تو بڑی ساری ہو گئی تھی۔
آج چوتھی یا پانچویں میں پہنچتی تھی۔ اور جہاں میں جاتی میرے ساتھ
جی رہتی۔ امی کا خیال تھا۔ کہ اسے مجھ سے پیار ہے۔
مگر ایسا پیار بھی کیا۔ جو نکلے گا اور ہی کر رہ جائے اس روز خیر
کا شک ہے۔ کہ وہ گھر پر نہیں تھی۔ بھابی ایکسا رشتہ دار کے گھر
گئی ہوئی تھیں اور مٹی کو ساتھ لے گئی تھیں۔

بھیا اوپر والے کمرے میں بیٹھے تھے۔ ناصہ بھی بھابی کے
ساتھ گئی ہوئی تھی۔ امی نیچے والے کمرے میں اب لگی تھیں
میں بن ٹانگ رہی تھیں۔ وہ ایسے کام خود ہی کیا کرتی تھیں۔
دوسروں سے ابائے کام لینا انہیں پسند نہ تھا۔

ابھی بتانا ہوں کہ میں نے انہوں نے جوتا اٹھایا۔

”میں بھی میں سمجھ کر سے کہہ رہی ہوں“ میں نے جواب دیا
”میں اسی سے بات کرنا چاہتی تھی۔ سو چاہیے اپنے اچھے بھیا سے
پوچھ لوں“

بھیا کسی قدر دلچسپی سے پوچھنے لگے۔

”پھر.....“

”پھر..... میں نے کہا“ میں نے ایک لڑکی پسند کیا ہے۔
اپنی سہیلی“ بھیا ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔ اور بوسے لگے جو میں
شادی نہیں کرواں گا۔“

”کیوں بھیا؟“ میں نے مصروفی حیرانی سے پوچھا۔

”میں تو اس لڑکی سے بات کر چکی ہوں۔“

”چل شریر کہیں کی“

بھیا بولے۔

”نہیں بھیا میں نے اپنی پسند کی لڑکی سے آپ کی شادی

کروانے کا فیصلہ کیا ہے۔“

”لگے۔ لہجہ“ وہ بولے۔ ”میں پہلے تعلیم مکمل کروں گا ساپنا

مستقبل بناؤں گا۔ پھر دیکھا جائے گا۔“

”تو آپ نے کسی کو پسند کیا ہے؟“ میں نے کہا۔

”نہیں تو“ وہ گھبرا گئے۔

”پھر آپ کیوں شادی نہ ادا کر کے رہے ہیں کیا بہن کے رشتے سے مجھے حق

حاصل نہیں کہ میں اپنی بھابی کا انتخاب کر سکوں؟“ میں نے جواب دیا۔

”تمہیں ضرور حق ہے۔“ بھیا نے سوچ میں ڈوبی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”مگر ماں باپ کا حق تم سے بھی زیادہ ہے اور باں۔۔۔ مجھے بھی تو

حق حاصل ہے کہ میں بھی اپنی پسند کا انتخاب کر سکوں۔“ تو اٹھ کر کھینے لگا۔

میں نے کہا۔

”مگر تم ایسی باتیں کیوں کرتی ہو؟ بھیا نے کہا۔ ”تمہیں مجھ اس قسم

کی باتیں نہیں سوچنی چاہئیں۔ میں پہلے اپنا مستقبل بنائوں گا۔ اور

پھر تمہاری شادی سے فارغ ہو کر اپنی شادی کروں گا۔“

”نہیں بھیا تمہیں بتانا ہو گا۔ کہ تم کسے پسند کرتے ہو۔“

میں نے پوچھا۔

”چلو بھگ جاؤ،“ بھیا ایک دم غصے میں آگئے۔ ”فمنوں داغ

کھا رہی ہو۔“

”نہیں“ میں نے جواب دیا۔ ”میں پوچھوں گی۔ ورنہ“

”ورنہ کیا؟“ بھیا نے گھور کر پوچھا۔

”خود بتا دوں گی۔“ میں نے کہا۔

”کیا بتائے گی؟“ بھیا بولے۔

”جو مجھے معلوم ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”ارسی تو کیا جانتی ہے۔؟“ بھیا نے اس انداز میں کہا۔

وہ بیٹھ گئی اور بولی -

”آپ مذاق کرتی ہیں۔“

”میں سمجھتی ہوں میری بھابی۔“ میں نے کہا اور کہتے سے اس کے سرخ رخساروں پر پیار سے ہوسہ دیا۔

”رضیہ بہن۔“ نامہ نے مرن اس قدر کہا۔ وہ نہ جانے کیا اور کہنا چاہتی تھی۔ مگر خاموش ہو گئی۔ میں نے اس کی دلی کیفیت کا اندازہ لگایا۔ وہ عجیب کشش و جذبہ میں تھی۔ اسے ایک ایسی ہنر سنانی لگتی تھی۔ جسے سنتے کے لئے وہ ایک مدت سے موانع قرار تھی اور ایک بے سہارا لڑکی ہی ان الفاظ۔ ”میں تمہیں چاہتا ہوں“ کی لذت سے میح طور پر آشنا ہو سکتی ہے۔ جسے کبھی کسی نے آپنا نہ کہا ہوں۔ اور جسے چاہنے والا اس کے لئے دل میں بے حد پیار رکھتا ہو اور اس کا اظہار کر دے۔ میں نے کہا۔

”تمہیں بیباک بنا رہے ہیں۔“

”کہاں ہاں میں نے پوچھا۔“

”وہ اپنے کمرے میں۔“ میں نے کہا۔

”نہیں۔۔۔۔۔۔“ اس نے دبے لفظوں میں کہا۔ ”میں نہیں جاؤں گا۔ میں نہیں جاؤں گی۔“

”مگر کیوں؟“ میں نے پوچھا۔ اس سے پہلے تو تم نے کبھی بھی اس کے کمرے میں جانے یا ان کی کسی بات کا انکار کرنے کا حوصلہ نہیں کیا تھا۔“

نامہ اپنے کمرے میں گم سم سم سی بیٹھی نہ جانے کیا سوچ رہی تھی؟ اسے کوئی علم نہ تھا کہ میرے اور بھیا کے درمیان کیا باتیں ہوئیں ہیں۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور بولی۔

”مبارک ہو نامہ۔“

”کسی بات کی۔“ نامہ نے بھولے پن سے پوچھا۔

”بھیا کہتے ہیں۔ میں نامہ سے پیار کرتا ہوں۔ اور میں نے اسے ہمیشہ اپنانے کا ارادہ کر رکھا ہے۔“

”سچ۔“ اس نے کہا۔ اسی کے چہرے پر خوشی سے سرخی دوڑ گئی اور ہچکل کر کھڑی ہو گئی۔ مگر پھر ایک دم نہ جانے اسے کیا خیال آیا کہ

”ہاں ہاں“ نامرہ نے جلدی سے کہا: ”مجھ سے بھی بڑی باتیں کی ہیں“
”کس کے بارے میں؟“ پوچھا اس نے جلدی سے پوچھا۔

”آپ کے بارے میں“ نامرہ نے جلدی سے کہہ دیا۔ اور
پھر شرانگھی۔ اس کی نظر اب آج زمین پر گڑی ہوئی تھیں۔

”میرے بارے میں؟“ بھیا نے کہا۔ ”کیا کہا تھا بھیا؟“
اب بھیا مردوں کے لئے ٹوٹے ہوئے تھے۔ ایسے سوڑے میں جس
پر تھوڑے انہیں استیاء نہ تھا۔ انہوں نے اپنے کمر نامرہ کو بازو
سے پکڑ لیا اور بولے۔

”نامری۔ بتاؤ نا۔ کیا کہا تھا؟“
”جہاں“ نامرہ گھبرا گئی۔ اور میں خوشی سے چھوٹی نہ سہائی۔
”جی کچھ نہیں۔ میرا مطلب ہے یاد نہیں۔“

”نامری“ بھیا نے جلدی سے کہا۔ ”پھر میں بھی بتا دوں گا کہ
اس نے مجھے کیا کہا تھا۔ پہلے تمہیں بتانا ہو گا۔“
”جی“ اب میں کیسے بتاؤں؟“ نامرہ نے بے چارگی سے
بھیا کے ہاتھ سے ہاتھ پھڑا کر کہا۔

”بیٹہ جاؤ نا“ بھیا نے گویا تھکنا نہ ہو کر کہا۔ اس لمحے میں
چھپی ہوئی پیار کی مٹھاس کو میں نے غسوٹا کیا۔ نامرہ بیٹھ
گئی۔ بھیا نے کہا۔

”نامری۔ تمہیں میری قسم۔ بتاؤ اس نے کیا کہا تھا؟“

”جی“ نامرہ نے چونک کر کہا۔ ”اس کے پہرے کے تاثرات
سے ایسا لگتا تھا۔ جیسے اسے دنیا کی سب سے بڑی قسم
دی گئی ہو۔ اس نے کہا۔“

”تھیک ہے۔ میں بتاتی ہوں۔ مگر.....“
”مگر کیا؟“ بھیا بولے۔

”مجھے شرم آتی ہے۔“ نامرہ نے جواب دیا۔

”شرم کس بات کی؟“ بھیا پوچھے۔ ”وہ ایسی کون سی بات ہو
سکتی ہے۔ جو ایک بہن کسی سے کہہ دے؟“

”انہوں نے کہا تھا کہ مجھے آپ سے..... نہیں نہیں بلکہ
آپ کو مجھ سے.....“ اور پھر وہ رک گئی۔

”ہاں ہاں کہو۔ کیا کہا تھا۔ کیا کوئی شکایت ہے؟“ بھیا نے
پوچھا۔

”نہیں۔“ انہوں نے شکایت نہیں کہا تھا۔ ”نامرہ نے کہا
”پھر کیا کہا تھا؟“ بھیا نے پوچھا۔

”پیار“ نامرہ نے جواب دیا۔

بھیا نے ٹپک کر نامرہ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے
لیا۔ اور بولے۔ ”تو کیا جھوٹ کہا تھا؟“

نامرہ نے جو زمین کو پیر سے کرید کر ہی تھی۔ ابستہ
سے کہا۔

”جی ہاں ٹھیک ہے۔“

پھر دونوں خاموش رہے۔ اچانک ناعمرہ نے کہا۔

”آپ کو رینہ باجی نے کیا کہا تھا؟“

”انہوں نے“ بھیا نے اچانک یوں چونک کر کہا۔ ”انہوں نے

مجھ سے کہا تھا کہ میں جانتی ہوں کہ ناعمرہ کو بھابی بنا لوں۔“

”یعنی کہ میری.....؟“

وہ پھر خاموش رہے۔ میں تابی سے ناعمرہ کے تاثرات

معلوم کرنے کے لئے اس کے چہرے کو کھینچی لگانے لگی تھی

بہتی تھی۔ اس نے اُہستہ سے کہا۔

”آپ نے کیا جواب دیا؟“

”میں کیا جواب دیتا ناعمری۔ انہوں نے خور ہی فیصلہ کر دیا

تھا۔ اور بڑی بہن کا کوئی بھی فیصلہ میں رد کرنے کی طاقت

میں کر سکتا۔“

بھیا نے یوں دامن بچایا تھا کہ میں خوش ہو گئی۔ میرا منہ

خمر سے تن گیا۔ اور میرے دل میں بھیا کے لئے چاہت کا

بے پناہ طوفان اٹھ پڑا۔ انہوں نے میری لاج رکھ لی تھی

اور ناعمرہ کی نظر میں میرا وقار بلند کر دیا تھا۔

میں نے دیکھا

کہ ناعمرہ نے نظریں اٹھا کر بھیا کی آنکھوں میں جھانک کر

دیکھا افسانہ آنکھوں میں کتنی محبت تھی۔ گویا دونوں

نے آنکھوں ہی آنکھوں میں زندگی بھر سا خوف دینے کا ارادہ کر

لیا ہو۔

میں خاموشی سے وہاں بیٹھی اور اپنے کمرے میں چلی گئی

کیونکہ مٹی بھیا کے کمرے کی جانب جارہی تھی۔

چھوڑنے کی کوشش کرتی۔ بھیا اور ناصرہ کو بھی یہ احساس تھا کہ میں ان سے کیا سلوک کر رہی ہوں۔ اور ان کی محبت کے عروج پر جانے میں میرا بھی بڑا دخل ہے۔ ایک روز میں نے ناصرہ سے کہا۔
 ”تم کتنی پیاری ہو ناصرہ۔ اگر میں لڑکا ہوتی۔ تو یقیناً تم سے شادی کر لیتی۔ اور تمہیں اپنا بنا لیتی۔“
 ”اگر میں لڑکا ہوتی۔“

ناصرہ نے اچانک پوچھ لیا۔
 ”تو میں تمہاری ہو جاتی۔“

”آخر کیوں؟“ ناصرہ نے پوچھ لیا۔
 ”اس لئے کہ تم مجھے بہت پیاری لگتی ہو۔“ میں نے کہا۔
 ”تمہارے بھیا بھی تم سے یہی بات کہتے ہیں۔“
 اس نے جواب دیا۔

”ہیک۔“ میں نے یوں پوچھا۔ جیسے مجھے اس بارے میں کچھ علم نہ ہو۔ ناصرہ شرانگنی۔ اسے ایک دم احساس ہو گیا کہ اس نے غلط بات کہہ دی ہے۔ پھر اس نے کہا۔
 ”چھوڑو ان باتوں کو۔ کوئی اور بات کرو۔“
 اور میں بھی خاموش ہو گئی۔

اس شام میں نے دیکھا۔ چھت پر بھیا اور ناصرہ بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ بھیا کہہ رہے تھے۔

کالنج کا زمانہ بھی کیا زمانہ ہوتا ہے۔ گویا خوشیاں سمٹ کر انسان کی جھولی میں اُلٹی ہوں۔ ہم کالنج میں اکٹھے جاتے تھے۔ بھیا کا کالنج ہمارے کالنج سے آدمے میل کے فاصلے پر تھا۔ میں اور ناصرہ ایک ہی کالنج میں بڑھتی تھیں۔ بھائی جان اور ابا جان کی خواہش پر میں نے بھی میڈیکل میں داخلہ لے لیا تھا۔ گویا ناصرہ کا بدولت ہماری قسمت بھی چک اٹھی تھی۔ ناصرہ اور بھیا کافی بے تکلف ہو گئے تھے۔ میں جانتی تھی کہ مستقبل کے ہونے والے میاں بیوی کے کیا جذبات ہوتے ہیں۔ اس لئے میں ان کی خوشیوں میں زیادہ دیر جا کر رہنا نہ چاہتی تھی۔ جب بھی موقع ملتا۔ میں انہیں زیادہ سے زیادہ تنہا

نصرہ میں چاہتا ہوں۔ کہ ہم دونوں طب کی تعلیم حاصل کر کے یہاں کے محرز ڈاکٹر بن جائیں۔ اور پھر میں تم سے شادی کر لوں۔ شادی کے بعد ہم غریب ملک میں اعلیٰ تعلیم کے لئے جائیں گے۔ اور میں تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گا۔ کتنا اطمینان رہے گا۔ ہمارے دل کی تمام مرادیں پوری ہوں گی۔ ہمارا اپنا گھر ہو گا۔ اور چھوٹے چھوٹے بچے ہوں گے جن سے ہم کھیلنا کریں گے۔

نصرہ نظریں جھکائے سب سنتی رہی۔ وہ بھیتا کی باتیں صرف سنا کرتی تھی۔ اُن سے کوئی بات کرنا نصرہ کی ہمت نہ تھی۔

بھیتا کی باتوں میں کتنا سرور تھا۔ وہ نصرہ کو کتنا چاہتے تھے۔ ہیں انجانے خیالوں میں کھسکتی۔ میرے دایم نزدیک میں پہلی بار ایک چنگاری سی اٹھی۔ کاش مجھے بھی کوئی چاہنے والا ہوتا۔ اور ایسی پیادیں ڈوبی ہوئی باتیں مجھ سے کرتا۔ نصرہ کہہ رہی تھی۔

”آپ بہت بے تاب ہیں۔ آپ خود پیر قائم نہیں کر سکتے۔ خواہ مخواہ میرا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو۔“

”تو کیا ہو گا۔“ بھیتا نے کہا۔

”بدنامی ہو گی۔ اور امی کو پتہ چل گیا۔ تو خواہ مخواہ ناراض ہو گی۔“ نصرہ نے جواب دیا۔

”ہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ گھر والوں نے دیکھ لیا تو کوئی بدنامی والی بات نہ ہو گی۔ وہ تمہیں میرے لئے پسند کر لیں گے۔ اور ہماری مشکل حل ہو جائے گی۔“ نصرہ یہ بڑی بات تو نہیں۔ کہ کسی کو چاہا جائے۔ اور تم میں کیا خرابی ہے۔ کہ میرے ماں باپ تمہیں بہت سبکیں۔ تم اسی گھر میں پل بڑھتی ہو۔ اور تمہارا سارا کچھ میرے گھر والوں کے سامنے ہے۔ اور بھائی سببان تو تمہیں نظروں سے اوجھل نہیں کر سکتے۔ ایسے حالات میں تمہیں کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں جانتی تھی۔ بھیتا خود کو تسلی دے رہی تھی۔

امی کو تو نصرہ سے خدا واسطے کا پر تھا۔ وہ بھلا اسے کیوں بہنو بنانے لگیں۔ یہ بھیتا کی خوش فہمی تھی۔ کہ وہ نصرہ کے بارے میں ایسا سوچ رہے تھے۔ کیونکہ امی کے علاوہ گھر کے سبھی دیگر افراد نصرہ کو پسند کرتے تھے۔ اچانک میں نے سنا نصرہ کہہ رہی تھی۔

”اگر ایسا نہ ہو سکا۔ تو۔“

”تمہیں یہ گھر چھوڑ دوں گا۔ دنیا بھر سے ملکر جاؤں گا۔ مگر تجھے کسی اور کے حواس نہیں کروں گا۔“ بھیتا نے ایسے

”فرادینا میں نے کہا ہے میں نے جن کاغذات پر لکھ رکھا تھا وہ گم ہو گئے ہیں۔“

”یہ کیسے؟“ نامرہ نے مجھے ایک کاپی دیتے ہوئے کہا۔
”مگر انہیں جلد فارغ کر دینے کی ضرورت تھی۔ میں نے خود ہی پڑھنے ہیں۔“
”میں اسی کے کمرے میں بیٹھ گئی۔ اور نوٹس دیکھنے لگی۔“
”اچانک ایک کاغذ پر میری نظر پڑی۔ تم کیسے؟“ اُس پر ایک مشر لکھا ہوا تھا۔

آسمانی تیری لہر پر شبنم افشانی کرے
سبزہ کو درستہ اس گھر کی نگہبانی کرے۔

(والدہ مرحومہ کی یاد میں)

میں نے اُسے بار بار پڑھا۔ میں نے نامرہ کی اس دلی کیفیت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ جو تنہائی میں والدہ کی یاد میں اس پر طاری ہوا کرتی تھی۔ مگر اچانک میری نظر دوسرے صفحہ پر گئی۔ جس پر ایک اور شعر لکھا ہوا تھا۔

اگر کوئی ہم کو سہارا نہ دے گا

تو اُسے اُسے زمانے کو عمر جاہیں گے ہم

میں نے اندازہ لگایا کہ اس میں بھیجے کے ایک سہارا اور بھائی جان کی بے لوث محبت ہی کا اثر ہے۔ جو نامرہ کو دلی سکون بخشتے ہوئے ہے۔ اور تب سے کبھی نے نامرہ میں

مردانہ عزم سے بات کی۔ کہ میں کانپ گئی۔ اگر واقعی ایسا ہو گیا۔ تو ہمارے بھیا ہم سے جدا ہو جائیں گے۔ ایک دم مجھے نامرہ ایک ایسی لڑکی دکھائی دی۔ جو گھر کو جہنم بنا دے گی۔ مگر بہت جلد نامرہ کے الفاظ نے مجھے چو نکا دیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”مگر میری وجہ سے ایسا نہیں ہونا چاہیے۔“

”تم میری عزت سو اور غیرت ہو نامرہ“ بھیا نے کہا۔
”اور میں تمہارے بارے میں جو سوچتا ہوں۔ وہ ضرور ہو گا۔“
”خدا کرے ایسا ہو جائے۔“ میں نے اُستد سے کہا۔

اور پھر میں نیچے اُتر آئی۔ کیونکہ نامرہ بھیا سے کہہ رہی تھی اب جانے دیجیے۔ میں نے کالج کا کام کرنا ہے۔ اور پھر بھی کسی کو شک ہو گیا۔ تو بڑی بات ہو گی۔

”بہتر ہے جاؤ۔“ بھیا نے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔
نامرہ نیچے اُتر آئی۔ اور بھیا نہ جانے کس سوچ میں ڈوبے ہوئے اوپر بٹھا بیٹھ رہے۔

میں نامرہ کے کمرے میں گئی۔ وہ ابھی اچھکے میں داخل ہوئی تھی میں نے کہا۔

”نامرہ تم نے انگریزی کے نوٹس لائے تھے۔“

”جی ہاں۔“ نامرہ نے جواب دیا۔

دیکھیں بیٹا شورو کا کتنی - میں نے تجھ کو کیا - کہ نامہ کچھ زیادہ
خوبصورت ہو گئی تھی - اس کے چہرے پر پہلے سے زیادہ لائی
گئی تھی - اور وہ کچھ زیادہ صاف ستھری رہنے لگی تھی - اور یہ سب
عہدت کی مہر تھی -
میں نے کاپی کی ورق گردانی شورو کر دی - ایک صفحے پر
لکھا تھا -

۱۔ اپنا جینا ہے سیج کا نٹوں کی -
اُن کے مرنے کا نام تاج کھوں -

میں نے اندازہ لگایا - کہ بھیا کے زندگی بھر سماعت
نجانے کس دعوے سے پیچھے چلائے شورو کیسے گئے ہوں گے -
ورنہ اس سے اگلے صفحے والا شعر بھی بالواسطہ میں ڈوبا ہوا
ہوتا - جب کہ وہ خوشی سے گویا لگتا تھا ہوا شعر تھا - ایک دم میں
نے غصہ میں کیا - کہ نامہ - اسے کس پر کھڑی سب دیکھ رہی ہے
میں نے کھینچی ہنسی ہنسی کر کہا -

”نامہ جو گئی ہے میری بھابی -“

”پھر وہی - نامہ نے کہا - اور دوسروں کی تھریس
یوں بغیر اجازت پر جسے کی آپ کو کس نے اجازت دی ہے -؟
اور اگر تم سے بھی اجازت کی ضرورت ہو سکتی ہے -؟
میں نے جواب دیا -

”مگر یہ شعر آپ کے لئے نہیں ہیں - نامہ نے کہا -

”پھر کس کے لئے ہیں؟“ میں نے پوچھا -

”تمہارے بھیا کے لئے -“ اس نے جواب دیا -

”تو انہیں پڑھو - لائن میں لے کر پڑھا -

”پہلی ہفت - نامہ نے مجھ سے کاپی بھڑکائی -

”دوسرے بار سے بھی وہ لوگس تو پڑھ لیتے دو -“

میں نے اٹھ کھڑا کیا -

”ہنس - نامہ نے کہا - اب بیٹا دوں گی -“

”میری ابھی ہنسنے کا وقت نہیں ہے - میں نے خوش انداز -

میں جانتی تھی - کہ میں کہہ کر نامہ سے برا کام لیا ہو سکتا ہے نامہ
نے کاپی - سے دھڑکیا اور کمر میرے سوا سے کرتے چوسنے لگا -

”لو اب میں کاپی نہیں دوں گی -“

اور میں ہنسنے لگے لگا - اچانک میں اُڑنے لگی اور

اس نے کہا -

”نامہ ابھی بھائی جان کی رہے ہیں -“

”ابھی آئی - نامہ نے کہا - اور تیری سے ابھی ہلکے تھکی -

جیسے کسی بیٹی کو باپ نے بلایا ہو - بھابی کا کافی دنوں سے

اپنے میکے گئی ہوئی عقیق - بھابی جان نے کہا -

”نامہ کہانیں سن رہی ہو - کتنی ہی دیکھو میں تمہاری ہنسنے لگی کرتے

کا پڑا لایا جس۔

اور انہوں نے ایک پکیٹ نامہ کو نکھار دیا۔

اسی تو گویا چنگی گئیں۔ انہوں نے چٹا کر کہا۔

”اور بہن کے لئے نہیں لایا“

”اے بھی لا دوں گا“ بھائی جان نے بیزار سی کہا۔

انہیں علم تھا کہ بہنوں کو تو ایسی چیزیں لا کر دینے والے بہت ہیں۔

اسی۔ ابا جان اور رشتہ دار۔ جب کہ نامہ دیکھ کر صرف بھائی

جان ہی ایسی چیزیں لایا کرتے تھے۔

انہوں نے نہ جانے منہ ہی منہ میں کیا کچھ کہا۔

یقیناً وہ نامہ کو گالیاں دے رہی تھیں۔ اور بھائی جان۔ نامہ

میں بیسی اور بھیتا سب خاموش بیٹھے تھے۔ امی نے اچھی فضا

کو مکر کر دیا تھا۔

خیمہ خیمہ خیمہ خیمہ خیمہ خیمہ



مگر میں ایک اور خوشی کا موقعہ آیا۔ اس موقعہ پر نامہ سب

سے زیادہ خوش تھی۔

میکے سے بھائی کے بھائی نے تار دیا تھا۔ کہ بھائی

نے ایک لڑکے کو جنم دیا ہے۔ بھیتا تو دق میں تھے۔ نامہ ہی

منے تار وصول کیا۔ اور سب کو خوشخبری سنائی۔ امی نے اسے بڑا

شگوان قرار دیا۔ اُن کا خیال تھا۔ کہ یہ خوشخبری کسی لڑکی

زبانی پہلے سنی چاہیے۔ عورت اگر لڑکے کے پیدا ہونے کی

خوشخبری سنائے تو لڑکے کے مستقبل کے بارے میں شک ہو جاتا

ہے۔ مگر بے چارہ نامہ کو کیا معلوم تھا۔ کہ امی خواہ مخواہ ایک

نیا شوشہ چھوڑ دیں گی۔ مگر وہ کسی حد تک اب امی کی طبیعت

سے واقف ہو گئی تھی۔ پھر میں نے بھی اسے سمجھا دیا کہ نامہ

”غیر نہیں۔ یہ بھی اپنی ہے۔“ بھیا نے اونچی آواز میں کہا۔
 ”پلیس میں یہ بہن بھائیوں کی طرح ہمارے ساتھ پروان چڑھی
 ہے۔“ یہ غیر نہیں امی۔ آپ کو اپنا رویہ بدلنا ہو گا۔ درنہ۔۔۔“
 ”درنہ کیا؟“ امی نے پوچھا۔
 ”درنہ میں یہ گھر چھوڑ دوں گا۔ جو جہنم بن چکا ہے۔“

بھیا نے جواب

وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔ وہ امی کی اس کمزوری
 سے واقف تھے۔ کہ گھر چھوڑ دینے کی ذمگی ان کے لئے سب
 سے بڑی دوسری ہے۔ امی خاموش ہو گئیں۔ وہ کچھ دیر سوچنے
 بیٹھی رہیں۔ اور پھر بھیا کے کمرے کی طرف چل دیں۔
 ہم گم سم دیں گھڑی رہیں۔ نہ جانے کمرے میں ماں
 بیٹے کے درمیان کیا باتیں ہوئیں۔ کچھ دیر بعد امی نے دیکھا۔ بھیا
 مسکراتے ہوئے کمرے سے نکل رہے تھے۔ امی ان کے
 ساتھ تھیں۔ امی نے کہا۔

”بھاؤ بیٹے۔ اب دفتر میں اپنے بھائی کو اطلاع دو اور
 کہنا۔ کہ ابھی چلا آئے۔ میں اپنے بچے کو دیکھنے ابھی جاؤں گی۔
 اور پھر اپنے ابا کے دفتر میں بھی جا کر اطلاع دے آنا۔“
 ”بہتر امی۔“ بھیا نے جواب دیا۔

بھیا نے مسکرا کر اصرار کی طرف دیکھا اور دائیں آنکھ بند کر کے اُسے

مخصوص اشارہ کیا۔ جسے امی نہ دیکھ سکیں۔ گم سم گھڑی نامہ بھی
 سکرائی۔ اور بھیا سائیکل سنبھال کر باہر چلے گئے۔
 شام کو چائے پر ابا جان بھائی جان سے کہہ رہے تھے
 ”بیٹے اپنے بیٹے کو دیکھنے کے لئے ہمیں محروم جانا چاہیے
 ہو کو بھی حوصلہ ہو گا۔“

چائے پینے کی ہمدانیش پر بھیا ماں باپ سے شرما رہے تھے
 ابا نے کہا۔

”میں گھر پر رہوں گا۔ تم سب لوگ جاؤ۔ اور بچے کو
 دیکھ آؤ۔ خدا نے ہم سب کو خوشی عطا کی ہے۔
 میں بھی جاؤں گی۔“

نامہ نے آہستہ سے بھائی جان سے کہا۔
 ”ہاں ماں۔ تم محروم جاؤ گی۔“

بھائی جان نے جواب دیا
 ”میں نہیں جاؤں گی۔ امی گویا بلک پڑیں۔“

”میکوں؟ سب نے یک زبان ہو کر کہا۔
 ”میری وہاں کیا مزدورت ہے؟“
 امی نے کہا۔

”امی؟ بھیا بولے۔“ دیکھئے آپ پھر بھول رہی ہیں؟
 امی خاموش ہو گئیں۔ نہ جانے بھیا نے ان کی کون سی دکھتی رنگ

پر ماحقہ دکھ دیا تھا۔

سب تیار ہو رہے تھے۔ تو میں بھیاس کے کمرے میں گئی۔

میں نے بھیاس سے پوچھا۔

”بھیا ایک بات پوچھوں؟“

”ہاں تو پوچھو، بھیا نے جواب دیا

”اب نے اسی سے کیا کہا تھا۔“ میں نے پوچھا۔

”کب؟“ بھیا نے کہا۔ ”کس سلسلے میں؟“

آپ کی بات یوں خاموشی سے مان لیتی ہیں کہ انہیں کوئی بات بنتی

ہیں بنتی

”جو بہن۔“ بھیا نے مسکرا کر کہا۔ ”ہر ماں کی کمزوری اس کی اپنی

اولاد ہوتی ہے۔ اور وہ اپنی اولاد کے لئے دنیا کی ہر قربانی دے

سکتی ہے۔ میں نے اسی سے کہا تھا۔ کہ انہوں نے اپنا رویہ نہ

بدلا۔ تو بن خود کشی کو لوں گا۔ کیونکہ میرا خیال ہے کہ اس قیام لڑکی

سے اسی زیادتی کر رہی ہیں۔“

”بس اتنی سی بات؟ میں نے پوچھا۔

”ہاں۔“ بھیا نے مسکرا کر کہا۔ ”یہ ذرا سی بات نہیں

بست بڑی بات ہے۔“

اور میں مسکراتی ہوئی اور بھیا کی چالاکی کی داد دیتی ہوئی اپنے کمرے

میں چلی گئی۔ بھیا نے اسی کو کتنے معصوم طریقے سے ایک میل کیا تھا

ہم سب بھابی کے والدین کے گھر بیٹھے۔ چاند سا مٹا تھا ہاں کے

پہلو میں بیٹا ہوا تھا۔ ناعمرہ نے چہشت کراستہ اٹھالیا۔ جیسے وہ

اس کا بھائی ہو۔ اور اسے جو مٹے لگی۔ پھر اس نے اچانک اسی کی

طرف دیکھا۔ اور یوں اسی کی گود میں ڈال دیا۔ جیسے وہ

اکھڑتا ہو۔ اور اس نے کسی پاکیزہ خیر کو چھو لیا ہو۔ اسی غصہ و ش

معتیں۔ اسی نے بھی بچے کو پیار کیا۔ بھابی بیمار اور کمزور دکھائی

دیتی تھیں۔ وہ چار پائی پر لٹٹی مسکراتی رہیں۔ اور ہم بچے کو پیار

کرتے رہے۔ اچانک اسی کو خیال آگیا۔

انہوں نے کہا۔

”سلیم بیٹے۔ ذرا وہیم کو بلانا۔ وہ کہاں رہ گیا ہے

اپنے بچے کو دیکھ۔ے۔“

”بہتر اسی جان۔“ بھیا نے ہوا ہوا دیا۔

اور اسی بھابی کی ہلایں سینے لگیں۔ اسی نے بھابی کا صدقہ اتارا

اور بھابی کو پیار کیا۔ اور مبادیگ بنا دئی۔

ناعمرہ بھی باہر کی طرف نکلی۔ میں بھی اسی کے پیچھے گئی

بھابی جان کرے میں آئے سے گھرا رہے تھے۔ دراصل وہ اسی

کی موجودگی میں بچے کو گود میں لیتے سے شرم رہے تھے۔ ہم سب

ایسی کچھ کراہت نہ لائے۔ انہوں نے بھابی کے چہرے پر ایک

نظر ڈالی اور سلا تم کیا۔ بھابی شرم کر سمٹ گئیں۔

وہ آج نہ جانے کیوں بھائی جان سے آنکھیں نہ ملا سکیں۔ امانے
 بچہ بھائی جان کی گود میں ڈال دیا۔ اور خود باہر نکلی گئی۔ موقعہ
 کی نزاکت کا احساس کر کے ہم بھی باہر چلے گئے۔ اور بھائی جان کو
 موقعہ دیا۔ کہ وہ تنہائی میں بیوی سے باتیں کر سکیں۔ اور بچے
 کو پیار کر سکیں۔

شام کو سب واپس آگئے۔ مگر میں بچے کے بغیر گھر
 سونا سونا دکھائی دے رہا تھا۔ جب کہ بچے نے ابھی اس گھر
 میں قدم نہ رکھا تھا۔ مگر میں اس وقت کا شدید انتظار تھا۔
 جب بھائی جان کے لڑکے کے معصوم ہتھ اس گھر میں میں کو نہیں
 گئے۔ نامہ سب سے زیادہ بے تاب سے منے کا انتظار کر رہی تھی
 مگر ہر حال بھائی سوا بیسے کے بعد ہی بچے کو لے کر آسکتی تھی
 بچہ بچہ بچہ بچہ



شام کے کمانے کے وقت ہم سب نے بھائی جان کو گھر لیا۔ کہ
 وہ اس خوشی کے موقعہ پر ہمیں تحفے دیں۔ بھائی جان نے پہلے ہی
 کب انکار کیا تھا۔ انہوں نے کہا۔

”ہاں بھی کیوں نہیں دیں گے؟ تم سب اپنی اپنی پسند کی چیز لیا
 تبادو میں تمہیں لادوں گا۔“

میں نے کہا۔ ”بھائی جان میں تو سرخ رنگ کی ساڑھیوں کی جیسی
 آپ بھائی کے لئے لائے تھے۔“

”اری اتنی مہنگی ساڑھی؟ بھائی جان نے کہا۔ ”وہ الہ کر دے“

کی مجھے

”کیوں ہی جب بھائی کے لئے لائے تھے تو دیوالیہ ہو گئے تھے کیا“

اب مجھے بھی لاکر دینا ہو گئی۔
میں نے کہا۔

وہ اور میں چھوٹا سا ٹرانسٹر لوں گی۔
میں نے کہا۔

”تم نے تو اس سے زیادہ ہنگامی بنا دیا۔ بھائی جان نے منی کے گال
پر ہلکا سا پتھر پال سے لٹکا کر کہا۔ مگر بھئی میری بھی۔ تم کیا یاد کرو گی
”اور تم؟“ بھائی جان نے بھی سے پوچھا۔

”بھائی جان آپ کی خوشی میرے لئے کیا کہیے۔ اور پھر ماما بھی
لئے کس کتنے سے کم ہوں۔ اتنے تھے ہوتے ہوئے اور کیا چاہیے؟“
بھیا کو نہ جانے کہاں سے غمزہ آگئی کہ انہوں نے یہ سب سنا
دیا۔ بھائی جان بے حد خوش ہوئے اور بولے۔

”ارے تم میرے بھائی ہو۔ تم خوش نہ ہو گے تو اور کون ہو گا۔
ہاں میں تمہارے لئے سوٹ کا کپڑا لا دوں گا۔ تیار کیا رنگ پسند کرو گے؟
”میں خود آپ کے ساتھ جاؤں گا اور پسند کر لوں گا۔“

بھیا نے جواب دیا

”اور ناعمرہ تم نے نہیں بتایا۔“ بھائی جان نے پوچھا۔

”میری آپ نے۔ وہ کوٹ چند روز پہلے تو لا کر دیا تھا۔
اب اور فروغ کر رہی ہے۔“

ناعمرہ نے جواب دیا۔

”عزیز کریں گے، بھائی جان نے جواب دیا۔ تم بتاؤ تو مجھے نہیں کون سا
تختہ دوں۔ مجھے سرخ رنگ کی اون لادیں گے گا۔“ ناعمرہ نے کہا۔

”اری بھئی صرف اون۔“ بھائی جان نے کہا۔ اور ہم سب ہنس دیتے
”جی ہاں صرف اون۔“ ناعمرہ نے کہا۔ میں اور کچھ نہیں لوں گی۔
”ٹھیک ہے جیسے آپ کی خوشی۔“
بھائی جان نے کہا۔

اور دوسرے دن بھیا بھائی اور اسی بازار گئے اور جہاں
انہوں نے بچے کے لئے کچھ چیزیں خریدیں انہوں نے ہمارے لئے
بھی کچھ خریدے ناعمرہ کے لئے خوبصورت اور قیمتی اون لائی
گئی۔ بھائی جان نے کہا۔

”ناعمرہ تم نے سب سے کم قیمت تختہ پسند کیا۔“

”اپنی اپنی ضرورت ہے۔“ ناعمرہ نے جواب دیا

اور اون کا پکیٹ لے کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

دن گزرتے گئے اور سو ماہ کے بعد بھائی پیارے پیارے
میں کو لے کر گھر آگئیں۔ گھر میں تو یا خوشیوں کا سیلاب امڈ
بڑا۔ ہر ایک کی خواہش تھی کہ وہ میں کو بھائی سے چھین لے
بھائی سب کا افسانہ دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں۔

میں کو انہوں نے گرم سٹائل میں لپیٹ رکھا تھا۔

اور اپنے سے جدا کرنے کو کسی صورت تیار نہ تھیں۔

صرف نامرہ خاموش تھی

سب نے منے کو دیکھا اور آخر بھابی نے کہا۔

”نامرہ تم نے منے کو گود میں نہیں لیا۔“

نامرہ اٹھ کر کمرے میں چلی گئی۔ وہ کچھ نہ بولی۔

سب خاموش ہو گئے۔ انہیں نامرہ کو یہ طریقہ پسند نہ آیا تھا سب

کا خیال تھا۔ نامرہ اس خوشی کے موقع پر رنگ میں بھگ ڈال دے

گئی۔ چنانچہ اسی نے کچھ کہنا چاہا۔ اس سے پیشتر کہ اسی کچھ کہتیں

سب نے دیکھا نامرہ اپنے کمرے سے آ رہی تھی۔ اس کے

ہاتھ میں ایک پیکٹ تھا۔

جو سبز رنگ کے کاغذ میں پٹا ہوا تھا۔ اس کے اوپر

گوٹا بندھا ہوا تھا۔ نامرہ نے وہ پیکٹ بھابی کی جھولی میں

ڈال دیا اور بولی۔

”یہ ختم منے کے لئے ہے۔“

”افسوس میرے پاس منے کو دینے کے لئے اور کوئی چیز نہیں

یرا خیال ہے۔“

”آپ کو یہ بھی پسند آئے گا۔“

جلدی جلدی بھابی جان نے بھابی سے جھپٹ کر وہ

پیکٹ کھولا۔ اور پھر سب کے منہ سے ایک دم نکلا۔

”ارے یہ کیا۔“

بھائی جان نے نامرہ کو ہوا، وہ تھپے میں لاکر دی تھی نامرہ نے اسکی سر ٹیڑھ

جرا میں اور پتھون بنائی تھی۔ اس نے نہ جانے اس دن سے سب

سے چوری کس وقت یہ سب نیا کر لیا۔ اور منے کو تھپے کے طور پر

پیش کر دیا۔ نامرہ کے خلوص پر سب خاموش ہو گئے۔ کسی کے پاس

نامرہ کا شکر یہ ادا کرنے کے لئے الفاظ نہیں تھے۔ پھر بھابی جان نے

دبے لفظوں میں بھابی کو سب کچھ بتا دیا۔ بھابی نے نامرہ کو بازوؤں

میں دبا لیا۔ اور پیار کرنے لگیں۔ وہ نامرہ کے خلوص سے بے حد

متاثر ہوئیں۔ اور اپنے گلے سے سونے کا مارا تاکہ نامرہ کے گلے

میں ڈال دیا۔

یہ ہار ایک ہزار سے کم قیمت کا نہ تھا۔ اسی نے جب دیکھا

تو یو لیں۔

”یہ کیا یہ کیا ہوا قتل سے کام لو۔“

”یہ میرا ہے اسی جان کا بھابی نے جواب دینا اور مجھے حق ہے۔“

پے کہ میں یہ جسے چاہوں دے دوں۔ اور نامرہ تو میری بیٹی ہے

میری اپنی نامرہ۔“

اسی جان کچھ نہ بولیں کیونکہ بھائی جان کے تیور بتا رہے تھے

کہ انہیں اسی کا درمیان میں خواہ مخواہ فساد برپا کر دینا اچھا نہیں

لگا۔ ہم سب بھی شرمندہ شرمندہ سے تھے۔

کیونکہ نامرہ گھر کی دنیا میں ایک بار پھر ہم سب پر باری تھی

فقیر۔ اس نے اپنا تحفہ منے کو دے کر سب کا دل جیت لیا تھا۔
 بھائی جان نے بھابی کو یہ سارا واقعہ سنایا جب بھیا سکول سے
 جاتے تھے اور سزا کے طور پر انہیں کھانا نہیں دیا گیا
 تھا۔ اور نامرہ نے اپنے حصے کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ رات کے پچھلے
 پیر اس نے اپنا کھانا بھیا کو کھلا دیا تھا۔
 بھابی بے حد خوش ہوئیں۔۔۔ نامرہ گویا اپنی تعریف سے
 شرمندہ سی ہو رہی تھی۔ اور میں سوچ رہی تھی کاش میں نامرہ جوتی
 اور نامرہ میری جگہ جوتی۔
 بھابی نے کہا۔

”میں نے کہا میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔“

”کس بارے میں؟ بھائی جان نے پوچھا۔“

”نامرہ کے بارے میں۔ بھابی نے جواب دیا۔“

”کیا فیصلہ؟ بھائی جان نے پوچھا۔“

”یہ بعد میں بتاؤں گی۔ اب نہیں۔“ بھابی نے جواب دیا۔

پھر انہوں نے غور سے بھیا کی طرف دیکھا۔ اور نامرہ کو دوسری نگاہوں
 سے دیکھ کر مسکرا دیں۔

میں سمجھ گئی کہ بھابی نے کیا فیصلہ کر رکھا ہے۔ میں خوش
 ہو گئی۔ تو گویا اس گھر میں میرا ہم خیال ایک اور بھی ہے۔ تو گویا
 بھیا اور نامرہ کے خوابوں کو حقیقت کا روپ مل جائے گا۔

بھیا اور نامرہ ایک ہو جائیں گے۔

نامرہ میری بھابی بن جائے گی۔ اور گھر پر اس کی حکومت ہوگی۔

مجھے اس خیال سے کتنا سکون ملا۔ میں نے نامرہ کو دیکھا۔

وہ زمین پر نظر ہی جمائے نہ جانے کیا سوچ رہی تھی؟

میں نے اندازہ لگا لیا کہ یقیناً وہ بھی ساری بات سمجھ گئی ہے۔ اور اس

بارے میں سوچ رہی ہے۔ بھیا نے خاموشی سے کھسک جانے

میں ہی مصلحت سمجھی اور میں بھیا کی شادی کے بارے میں سوچنے لگی

میں نے تصور میں نامرہ کو ماہن بنی ہوئی محسوس کیا۔ اور میرے

ذہن میں شہنایاں گونجنے لگیں۔

ہو ایوں کہ ایک روز میں غسل خانے سے پھسل پڑی اور پاؤں
میں سخت موٹن آگئی۔ رات ہوتے ہوتے پاؤں اس قدر سوج گیا کہ
میں چل پھر بھی نہ سکتی تھی۔ میں نے بھیا سے کہا کہ وہ دوسرے روز
میرے کالج میں درخواست دے آویں کہ میں کالج نہ آؤں گی۔
تاکہ میری غیر حاضری نہ لگ جائے۔ میرا خیال تھا کہ ناصر وہی کالج میں
جائے گی۔ مگر ناصر نے کہا۔

”میں مزدور کالج جاؤں گی میں تمہاری درخواست دے دوں گی۔“
”اری تم ایسی جاؤ گی؟“ میں نے پوچھا۔

”ہنیں ایسی کیوں جاؤں گی۔“ ناصر نے جواب دیا۔ ”سیلم جو میرے
ساتھ ہوں گے۔ میں ان کے ساتھ کالج جاؤں گی۔“ وہ مجھے
کالج چھوڑ کر جا بیٹے گئے۔ جیسے ہر روز ہم دونوں کو چھوڑ کر
آتے ہیں۔

”بہتر میں نے جواب دیا۔“ میرے خیال میں یہ ایک معمولی
بات تھی۔ مگر اس روز بھیا نے ایک بھیا تک غلطی کر ڈالی۔
انہوں نے راستہ میں ناصر سے کہا۔
”ناصرہ ایک بات کہوں مانو گی۔“

”قریبیہ۔“ ناصر نے جواب دیا۔ ”مزدور مانو گی۔“
”قسم کھاؤ مزدور مانو گی۔“ بھیا نے کہا۔
”آپ کی قسم۔“ ناصر نے مسکرا کر کہا۔



ناصرہ اور بھیا کے پیار کا بھابی اور میرے سو کسی دوسرے کو معلوم
نہ تھا اور نہ ہم کوئی چاہتے تھے کہ کسی کو بھی اس کا علم ہو۔ کیونکہ یہ
خاندان کی مشترکہ بدنامی کا سوال تھا۔ بھیا ناصر سے یوں گھل مل گئے تھے
کہ دونوں نے وہ پرانے تمام تکلفات چھوڑ دیئے تھے۔ جواب تک
ان کے درمیان حائل تھے۔ دوسرے لفظوں میں بھیا اور ناصر کے
پیار میں وارننگی آگئی تھی۔ مگر ان ہی دنوں ایک اور واقعہ رونما ہوا جس
نے بھیا اور پیار کا بھانڈا سر بازار پھوڑ دیا۔ یہ بھیا کی غلطی تھی کہ انہوں نے
ناصرہ کو مجبور کر دیا کہ وہ ان کے ساتھ فلم دیکھنے چلے۔

آج کالج سے چھٹی کر لیں تو بھیانے کہا۔

”کیوں تو نامہ چونک پڑی۔“

”آج میرا استاد چھٹی پر ہے۔ اور ہم کلاس میں خواہ مخواہ پورہن گئے۔ آج فلم دیکھی جائے۔“

بھیانے کہا۔

”مگر نامہ نے کہا جا۔“

”اگر مگر نہیں۔“ بھیانے سب کچھ سمجھ کر جواب دیا۔

”تمہارا خیال ہے مگر والوں کو تیرے چل جانے کا۔“

”جی ہاں میرا یہی خیال تھا۔“ نامہ نے کہا۔

”وہ کسی کو تیرے نہیں چلے گا۔“ بھیانے جواب دیا۔ ”آپ میرے ساتھ

بڑے اطمینان سے فلم دیکھ سکتی ہیں۔ اور یہ میرا حکم بھی ہے اور

درخواست بھی۔“

نامہ کو بھیا سے شدید پیار تھا۔ وہ ان کی بات کو رد نہ کر سکی

اور حامی بھری۔ بھیانے کہا۔

”تم بھی درخواست لکھ دو میں تم دونوں کے لئے چھٹی کی درخواست

دے دوں گا۔“

چنانچہ میرے ساتھ نامہ کی چھٹی کی درخواست بھی دے دی گئی

اور بھیا کے ساتھ انہوں نے فلم دیکھنے کا پروگرام بنایا اور صبح کے شو

کے لئے سینما ہال کی طرف چل پڑے۔ اتفاق دیکھئے کہ ابا کو دفتر سے

ٹیلی فون پر فرم کے مینیجر نے سینما ہاؤس میں بلایا۔ کیونکہ اس نے

سینما ہاؤس کے مالک سے زمین کا سود کرنا تھا۔ وہ زمین سینما ہاؤس کا

مالک فروخت کرنا تھا۔ چنانچہ ابا سینما ہاؤس جا پہنچے۔ جہاں وہ کاغذات

کی تیاری میں لگے رہے۔ اچانک ان کی نظر باہر کی طرف لگی۔ اس نے یہ

کہا۔ ”ان منہ سے نکلا باہر نامہ اور بھیا سینما کے ٹکٹ خرید رہے تھے

ابا نے چپکے سے ان کا بھیا کیا۔ اور جب وہ سینما ہاؤس میں چلے گئے

تو جیہاں اولاد کا خیال کر کے ابا واپس چلے گئے۔ انہوں نے بھیا اور

نامہ کو اس حالت میں کچھ کہنا مناسب خیال نہ کیا۔ اور وہ دونوں

اس بات سے بے خبر تھے کہ ابا انہیں دیکھ چکے ہیں۔ چنانچہ وہ ایسا

سے فلم دیکھتے رہے فلم تین بجے ختم ہوئی اور اس طرح دونوں

ایک گھنٹہ دیر سے مگر پہنچے۔ ابا ابا ہی مگر نہیں پہنچے تھے۔ اسی لئے کہا

”سلیم بیٹے آج تم اکٹھے آئے ہو؟“

”ہاں امی میں تو اکثر دیر سے گھرا تا ہوں۔ سوچا آج نامہ اکیس گھر

جائے گی۔ اسے لے کر جاؤں۔ اور آج ان کے کالج میں کوئی

فنکشن تھا۔ اس لئے اسے دیر سے چھٹی ہوئی۔ ظاہر ہے میں بھی

دیر سے آیا۔“

برائے معقول تھا۔ مگر امی نے بڑا سامنہ بنایا۔

ان کا بیٹا دوسروں کے لئے سر در دموں ہے۔ مگر اس کا کیا

علاج ہے۔ وہ خاموش رہیں۔ کیونکہ بھائی جان بھی گھرا گئے

ہتھ۔ اور اگر وہ بڑبڑاوتوں تو گھر کی فضا حکمہ ہونے کا خدشہ تھا۔
 تنگہ ہارے پہلے گھرا گئے تھے۔ وہ اپنی خوش دیکھنا چاہتی تھیں۔
 چنانچہ وہ ان کے لئے کھانا لینے چلی گئیں۔ نامرہ میرے پاس آئی
 اور میرا حال پوچھا میں نے کہا۔
 ”کچاں رہی نامرہ؟“

وہ خاموش رہی میں نے سوال کیا
 ”آج اتنی دیر کیوں کر دی؟“

نامرہ نے پھر جواب نہ دیا۔ اور میں اسے گھورتی رہی میں نے
 ”آج کوئی خاص بات ضرور ہے؟“
 ”ہاں“ نامرہ نے جواب دیا۔ وہ خاموش خاموش تھی۔
 ”کیا بات ہے؟“

میں نے پوچھا
 ”اس نے ایک غلطی کی ہے۔“ نامرہ نے جواب دیا۔
 ”ارے کیا کر بیٹھی؟“ میں حکمرانہ ہو گئی۔

”اتوں کاٹ نہیں گئی۔“ نامرہ نے جواب دیا۔ اور تہارے
 سینا کے ساتھ میں نے
 وہ خاموش ہو گئی۔ میں چونک پڑی۔ اس نے نہ جانے کیا
 حرکت کر دی ہے۔ میں نے اعتراف سے پوچھا۔
 ”نامرہ کیا کیا تم نے.....“

”میں غصہ کر رہی ہوں کہ کچے ہونے والا ہے۔.....“
 نامرہ نے جواب دیا۔

میں کانپ گئی۔ تو حالات یہاں تک پہنچ گئے ہیں۔ میں نے
 خاموشی اختیار کر لی۔ اب کیا ہو گا؟ پھر میں نے کہا۔
 ”تمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ نامرہ تم نے بہت برا کیا۔ اب کیا ہو گا؟“
 نامرہ اداس ہو گئی اس نے کہا۔

”ابا ناراض ہوں گے اور بھائی جان بھی نہ جانے کیا خیال کریں“
 ”تم نے سب کی ناک کٹوا دی۔“ میں آہستہ سے کہا۔
 میں کچھ سوچنے لگی۔ بلکہ بہت کچھ سوچنے لگی۔ مجھے بھید سے یہ
 امید تھی۔ نامرہ نے کہا۔

میں مجبور تھی باجی۔ انہوں نے مجھے قسم دی تھی کہ میں کانٹے سے
 چھٹی کر لوں اور ان کے ساتھ.....
 ”تو تم نے کانٹے سے چھٹی بھی کی ہے۔“ میں نے بات کاٹ کر کہا۔
 ”جی ہاں۔ اور پھر وہ مجھے سینما دکھانے لے گئے۔“
 نامرہ نے کہا۔

”پھر..... پھر کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔
 ”پھر..... پھر کچھ بھی نہیں۔ ہم نے فلم دیکھی اور گھرا گئے۔“
 نامرہ نے بھولپن سے جواب دیا۔
 ”بس اتنا سی بات ہے۔“ میں نے کہا۔

میں انہیں بھائی نہیں سے زیادہ رشتہ دینے کے بارے میں سننے بھی
نہ سکتا تھا۔

”کیا ہو آخر؟“ امی نے بے تابی سے پوچھا۔

”تمہارے لالہ کے کروتوت ہیں۔“ ابا نے تیزی سے قدرے بلند آواز
میں کہا۔ ”آج وہ کالج نہیں گیا۔“

”تو سمجھا دیا ہوتا اتنا شور۔۔۔۔۔۔“ امی نے کہنا چاہا۔

”پوری بات تو سنو۔۔۔۔۔۔“ ابا چلائے۔ ”خواہ مخواہ بات کاٹ
کر یوں شروع کر دیتی ہو۔“

”امی خاموش ہو گئیں۔ انہیں ابا کے غصے سے ہمیشہ ڈر لگتا تھا
ابا نے کہا۔

”آج وہ اور نامہ کالج سے بھاگ کر غم دیکھنے گئے ہیں۔“

”یہ غلط ہے میرا بیٹا۔۔۔۔۔۔“

”امی نے کہنا چاہا۔

”تو میں جھوٹ بول رہا ہوں۔“

”ابا چلائے۔ ہوش سے بات کرو۔

”وسیم کی ماں۔“

”نہیں میں تو۔۔۔۔۔۔“ امی نے کہا۔ ابا نے بات کاٹ

دی۔

”رضیہ کو بلاؤ۔“

”اور کیا بات ہوگی باجی؟“ نامہ نے بھولپن سے کہا۔

”میں نے لمبی سانس لی۔ میں نہ جانے کیا سوچنے لگی تھی۔ میں نے بے

سینے سے لگا کر صبح لیا تھا اور کہا۔

”نامہ تم نے تو مجھے بیسے متفر کر دیا تھا میں رجنے کیا خیال کرنے لگی تھی؟“

نامہ سمجھ گئی اس نے کہا۔

”باجی ایسا کبھی نہیں ہو گا ہم جو انی کے راستے سے جھک نہیں سکتے۔ اور

اگر ایسا ہو گا تو نامہ گھر نہیں آئے گا۔ سبکی لاش آپ کو ملے گی۔“

”اور میں مطمئن ہو گئی۔

اتنے میں ابا کی آواز سنائی دی۔ وہ چلا رہے تھے۔

”وسیم کی ماں۔ وسیم کی ماں۔“ وہ اسی وقت ایسی آواز میں بولا کہ

تھے۔

جب ان کا نعرہ رواج پر ہو۔

”میں کانپ گئی۔ نہ جانے کس سے کیا غلطی ہو گئی ہے۔

ایک دم مجھے خیال آیا۔ کہیں ابا کو نامہ اور بھیا کے کالج نہ جانے

کا پتہ تو نہیں چل گیا۔

”ناہوش پنہ کمرے میں چلی گئی۔ میں دروازے سے کان لگا کر ابا

اور امی کی باتیں سننے لگی۔ ابا کہہ رہے تھے۔

”میں تو سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ حالات اتنے خراب ہو سائیں گے اور گھر کے

بچے یوں عشق کی پیگیں بڑھاتے پھریں گے۔

ای نے آواز دی تے رملیہ بیٹا ذرا آنا
میں اباب کے کمرے میں گئی۔ مجھ سے بشکل چلا جاتا تھا۔ میرے پاؤں
کو دیکھ کر ابابا نصہ کسی قدر کم ہوا۔ انہوں نے کہا۔
”بیٹھ جاؤ۔“

میں بیٹھ گئی۔ ابابو نے

”بیٹا کیا حال ہے؟ پاؤں میں زیادہ تکلیف تو نہیں؟“

”جی اب کچھ ٹھیک ہے۔“

میں نے جواب دیا۔

”ایک بات سچ بتاؤ۔ ابابو نے۔“

”جی فرمائیے؟“ میں نے کہا۔

”نامرہ نے کبھی اس سے پہلے بھی کالنج سے چھٹی کی ہے؟“

ابانے کہا۔

”جی نہیں۔“

”تو میرے ساتھ جاتی ہے۔ کبھی کالنج سے غیر حاضر نہیں رہی اور

جلے لگے کبھی کہاں میں تو۔۔۔۔۔؟ میں نے جواب دیا۔

”فصل تو نہیں کہہ رہی ہو۔“

ابانے کہا۔

”جی نہیں۔ آپ کالنج کی روزانہ حاضری دیکھ سکتے ہیں۔“

میں نے جواب دیا۔

”نہوب“ ابانے کہا۔ تم جاؤ۔ اور نامرہ کو بھیج دو۔“

میں نے نامرہ کو ابابا کے کمرے میں بھیج دیا اور خود چلی گئی۔

ابانے بھیا کو بلا لیا اور بولے۔

”تم لوگ آج کہاں تھے؟“

”جی“ نامرہ چونک پڑی۔ تو کیا سب بات معلوم ہو گئی۔

اس کا دل چاہا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے

وہ رونے لگی ہی نے چلو کہہ کیا۔

”میرے بیٹے کو خراب کر کے اب آنسو بہاتی ہے۔“

”تم خاموش رہو۔“ ابانے کہا۔ اور پھر نامرہ سے کہا۔

”میں تم دونوں کو نصیحت کرتا ہوں کہ اپنے کام اور تعلیم سے مطلب رکھو

دوسروں کی دیکھا دیکھی خواہ مخواہ خراب کام کرنے سے کچھ حاصل نہ

ہو گا۔ اور مال اب تم بچے نہیں جویاں ہو۔“

زیادہ میں ملاپ نہ کر سکا کرو۔ اور ایک دوسرے کے کمرے

میں بھی مت جاؤ۔“

”جی۔۔۔۔۔ نامرہ نے کہنا چاہا۔“

”کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔“

ابانے اطمینان سے جواب دیا۔

”میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ میں تمہاری خوشی غم پوری کر دوں گا

مگر وقت آنے پر اب جاؤ اور سنبھل سوخ کر رہنا۔“

سیکھو۔ آئندہ میں کو حرکت برداشت نہیں کروں گا۔

بھیا اور نامہ چلے گئے۔ ابانے امی سے کہا۔

”ان دونوں کا زیادہ میں ملاپ ختم ہونا چاہیے۔ تم ان پر نظر رکھو اور

گھر کو گھر سی رہنے دو۔“

امی خاموش رہیں اور ابانہ کو صحن میں بیٹھے۔

جہاں وہ بھائی جان سے آنے ہوئی بات کے بارے میں باقی کرنے لگے۔ بھائی جان انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کر رہے تھے مگر

ابانہ نصیحت کر رہا تھا۔

نامہ میں اور بھیا اپنے اپنے کمروں میں گم سم بیٹھے تھے۔

بھائی نے ابانہ نصیحت کر دینے کے لئے منہ کو ابانہ کی گود میں ڈال دیا۔
ابانہ نے اپنے سے پوتے سے کھیلنے لگے۔ اور ان کا غصہ جاتا رہا۔

امی کو نامہ پر ظلم کرنے کا ایک بار پھر موقع مل گیا۔ گویا ابانہ کی طرف سے

ان کو اجازت مل گئی کہ وہ نامہ سے من مانی کاروائی کریں اور اس

پر زبانی رو رکھیں۔ گویا ابانہ امی کو کھلے لفظوں میں ایسی کوئی

اجازت نہ دی تھی۔ مگر ابانہ کی طرف سے عاید شدہ پابندیاں امی کے لئے

کافی تھیں۔ امی نے نامہ اور بھیا کا منہ بند کر دیا اور ایک بار

پھر نامہ سے گھر کے سارے کام لینے لگیں۔ ان کا خیال تھا کہ

بیکار گھر میں بیڑی بیڑی نامہ اگر ایسی بڑی باتیں نہ سوچے گی۔

تو او رکیا سوچے گی۔ لہذا اسے گھر کے کاموں میں حصہ لینا

چاہیئے۔ نامہ نے گو کوئی احتجاج نہ کیا مگر وہ بھیا سے پیار میں

بہت آگے بڑھ چکی تھی۔ اور یہ تو دنیا جانتی ہے کہ چڑھتی ہوئی جوانی

اور بے پائی کو لاکھ بند باندھ کر بھی روکا نہیں جاسکتا۔ چنانچہ

نامہ اور بھیا کے پیار کو بھی روکنا امی یا کسی اور کے بس کی بات نہ

حق۔ یہ الگ بات ہے کہ پابندیوں نے انہیں ایک دوسرے سے
الگ کر دیا تھا۔ بھیا اب بھی ہمیں کالج چھوڑنے جاتے تھے اور سنگی
بہن کی موجودگی میں دنیا کا کوئی بھی بھائی اپنی محبوبہ سے کسی قسم
کی بات نہیں کر سکتا۔ چنانچہ بھیا نے بھی نامرہ سے کبھی کوئی ایسی
بات نہیں موجودگی میں نہ کی۔ مگر دونوں کی آنکھوں سے ان کے
دل میں چھپا ہوا پیار میں آنے پڑا تھا لیا کرتی تھی۔ اور اکثر ان کو
موقع دیتی تھی کہ وہ ایک دوسرے سے مل کر دل کی بات کہہ دیں۔
ایک روز میں نے نامرہ سے کہا۔

”نامرہ بھیا سے تم کوئی بات نہیں کرتیں؟“

”جی کیا بات کروں وہ بے ایسی سے بولی۔“

”بس بونہی جو بات بھی دل میں آئے رچیے تم پہلے بہت ساری باتیں کرتے
تھے۔“ میں نے جواب دیا۔

”مجھے منع کر دیا گیا ہے۔ پھر میں کیوں ایسا کروں۔؟“

نامرہ نے جواب دیا۔

”تو کیا تمہارا دل بھی نہیں چاہتا۔؟“

میں نے پوچھا۔

”دل چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟“ وہ بولی

”دور رضیہ بہن میں ازل سے بد نصیب ہوں

میں کیا کروں۔۔۔ یہ سب میرے مقدر کی خرابی ہے۔“

”تم بھیا کو خط لکھ کن کی کتاب میں رکھ دیا کرو۔ وہ جواب دے
دیا کریں گے۔“ میں نے مشورہ دیا۔

”بہنیں ’’دہ بولی۔‘‘ میں ایسا کیوں کروں؟ یہ کوئی شریفانہ
طریقہ بھی تو نہیں۔“

”تمہاری مرضی میں نے جواب دیا۔ میں نے تو صرف
مشورہ دیا ہے۔“

نامرہ خاموش ہو گئی۔ اور لگے روز میں نے دیکھا نامرہ
میں سے کہہ رہی تھی۔

”بھی بہن یہ سب جاؤ اور یہ دسیم بھیا کے کمرے میں
رکھ آؤ۔ یہ ان کی کتاب ہے۔“

اور میں نے وہ کتاب نامرہ سے لے لی اور بھیا کے کمرے میں
رکھی۔ جب وہ ان کی زیر رکھ گئی۔ آگئی۔ تو میں پچکے سے بھیا کے
کمرے میں گئی اور کتاب افکار اس کا تلاشی لینے لگی۔ نامرہ اپنے
کمرے میں تھی اور بھیا دباؤ نہ دہیں تھے۔ میں نے دیکھا کتاب کے
درمیان میں ایک خط پڑا تھا۔ اس پر صرف چند الفاظ لکھے تھے
مگر چند الفاظ ہی جوڑی تحریروں سے زیادہ تھے
نامرہ نے لکھا تھا۔

سیام صاحب

میں اپنی طرف سے معافی مانگتی ہوں۔ میں مجبور ہوں

”جی ہاں۔“ میں نے شوک لنگل کی جواب دیا۔

”تمہیں نہیں پڑھنا چاہیے تھا۔“ انہوں نے کہا۔ اور پھر
رک کر بولے

”وہ میری قیض میں بن لگا دیئے۔“

میں اٹھ کر بھابی کے پاس چلی گئی۔ اور قیض میں بن لگانے
لگی۔ بھیا اپنے کمرے میں آچکے تھے۔ اچانک میں نے دیکھا۔
بھیا اور نادرہ بھائی جان کے ساتھ ان کے کمرے میں داخل ہو
رہے تھے۔ وہ کچھ چورسے محسوس ہو رہے تھے۔
جیسے انہوں نے کوئی بہت بڑی غلطی کی ہو۔ میں اٹھ کر بھیا کے کمرے
کے قریب آگئی۔ بھائی جان کا کمرہ اس سے ملحق تھا۔
میں باتیں سننے لگی بھائی جان بڑے اچھے موڈ میں تھے انہوں نے
کہا۔

”ٹیکو و نادرہ اور تم بھی۔“

وہ دونوں بیٹھ گئے۔ انہیں حادہ تھا کہ بات کیا
ہو نے دانی ہے۔ بھائی جان نے کہا۔

”نادرہ میں نے تمہارا وہ خط پڑھ لیا ہے۔ اور ابا جان
سے بھی سن لیا ہے کہ تم نے فلم دیکھی تھی۔ کیا تم ایک دوسرے
کو پسند کرتے ہو؟“

نادرہ خاموش رہی۔ بھائی جان نے کہا۔

اور آپ اسے بخوبی سمجھتے ہیں۔

آپ کی نادرہ

یہ چند الفاظ جو بھیا کے لئے تھے۔ انہیں بھیا ہی سمجھ طریقے
سے سمجھ سکتے تھے۔ اور وہی ان سے لطف اندوز ہو سکتے
تھے۔ اچانک میرے پیچھے کسی کے قدموں کے چاپ بھٹی۔
میں نے گھوم کر دیکھا۔ بھائی جان اندر آ رہے تھے۔ تم
یہاں ہو راضی۔ وہ بولے۔ ”میں تمہیں باہر تلاش کر رہا تھا۔
ذرا میری قیض میں بن لگ دو۔ تیری بھابی کی طبیعت
خراب ہے۔“

میں نے جلدی سے وہ کاغذ بھیا کی کتاب میں رکھ
دیا۔ اور بے تحاشا باہر بھاگی۔

میں نے بھائی جان کو جواب بھی نہ دیا مجھے یوں لگا۔ جیسے
میری ساری سازش بھائی جان کو معلوم ہو گئی ہے۔ میں خود سے
شرمندہ سی ہو گئی۔ اور گرا کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

بھائی جان نے وہ کاغذ بھیا کی کتاب سے نکال لیا۔ اور اسے
پڑھ کر حیرت میں رکھ لیا

بھیا اور نادرہ کے بارے میں وہ ابا جان سے کافی سن

چکے تھے۔ انہوں نے میرے کہنے میں آکر کہا۔

”نادرہ کو یہ خط تم نے پڑھ لیا ہے؟“

”یہ میرا فرض ہے“ میں نے جواب دیا۔
 ”اب مسکرا دو۔ میں تمہیں روتا ہوا نہیں دیکھ سکتی نامرہ بھابی۔“
 نامرہ نے میری طرف دیکھا۔ اور اس لفظ کی لذت
 سے مسکرا دی۔

شیرت شیرت شیرت



ہماری ایک خالہ تھیں۔ جن کی شادی ایک بہت بڑے امیر
 سے ہو چکی تھی۔ اور وہ بہت دور کسی شہر میں رہتے تھیں۔
 جب ان کے ہاں ایک بچی نے جنم لیا تو بچی تو زندہ رہی مگر
 ہماری خالہ اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ اس بچی کی پرورش اس بزرگ
 کے باپ نے بڑے ناز و نعم سے کی اور اسے مانا نام ساتھ رکھا۔
 امیر کو ساتھ سے بڑا پیارا تھا کیونکہ وہ ان کی مرضی اور اپنی کی کھوتی
 نشانی تھی۔ اور خالہ نے اپنی جان و مال کو اس بچی کو بہن و بھائی
 ساتھ باہر لے لیا تھا۔ اس نے ایف۔ اے کر کے
 بونیولیم ترک کر دی تھی۔ اور کئی سال تک وہیں رہی۔ اس کی کئی کتابیں
 چھپ چکی تھیں۔ باپ کے پاس بے شمار روایتی اور جدید ادب

تھی۔ جس کی واسطہ وارث سائلہ تھی۔

سائلہ ایک باذوق خواصورت۔۔۔ عتیقہ شعار اور آزاد خیال لڑکی تھی۔ وہ ہماری طرح پردے کی بھی پابند نہ تھی۔ اس کے باپ نے اسے اپنے زوار دی دے رکھی تھی۔ باپ نے بچی کی تعلیم و تربیت اور پرورش میں ماں بن کر دلچسپی لی تھی۔ اور اسی کا خاطر دوسری شادی نہ کی تھی۔ اب وہ خود سرکاری کام کے لئے ایک سالہ کے لئے لندن جا رہے تھے۔ اور سائلہ کو انہوں نے ہمارے ہاں چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ہمیں جب انہیں نے اطلاع دی کہ سائلہ آ رہی ہے۔ تو ہم خوش سے بھولے نہ سمائے۔ ہم امتحان سے فارغ ہو کر قیسمے کا انتظار کر رہے تھے۔ سائلہ بہن بھی تھی اور مہیلی بھی۔ وقت خوب گزرے گا۔ چنانچہ ہم اسے لینے کے لئے اسٹیشن پر پہنچے۔ سائلہ کے ابا ساتھ آئے تھے۔ ہم نے اس کا بڑا گرم ہوشی سے استقبال کیا۔

ای تو اسے دیکھ کر باغ باغ ہو گئیں۔ انہوں نے مجھ بہن کی اولاد کو لڑے کے بعد دیکھا تھا۔ انہوں نے سائلہ کو خوب خوب پیار کیا۔ اور اس کے ابا سے کہا "اتنی سی دیکھی تھی۔ اب ماشاء اللہ اتنی بڑی ہو گئی ہے۔ خدا کر دہ انداز سے۔"

مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ رات کے کھانے پر

جب صبح کھانا کھانے بیٹھے تو سائلہ کے ابا نے کہا۔

"میں نے منشی کو کہہ دیا ہے۔ وہ پانچ سو روپے ماہوار سائلہ کا خرچ بھیجتا رہے گا۔ اور سائلہ میرے آتے تک آپ کے پاس رہے گی۔ اور یوں بھی بہن یہ آپ کی بچی ہے۔"

"کیوں نہیں؟" امی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

بچے تو یہ رضیہ سے زیادہ عزیز ہے۔ منی کو بھی سائلہ کے آنے سے بے حد خوشی تھی۔ دو دن سائلہ کے ابا گھر میں رہے۔ اور ان کی خوب خاطر مدارت ہوئی۔ سائلہ کے ابا نے ہمارے بھیا سے خوب باتیں کیں۔ وہ تو گویا ان کے دوست بن گئے تھے۔ اور ہر وقت اس سے باتیں کرتے رہتے تھے۔ اور جس دن سائلہ کے ابا نے جانا تھا ہمارے ابا۔ امی اور سائلہ کے ابا ہمارے ابا کے کمرے میں جمع ہوئے۔ امی نے کہا۔ "بھائی کھان ایک بات کرنی ہے۔ اگر بڑا نہ مایوس تو۔"

"ارے میں کیوں بڑا مایوس رہا۔"

سائلہ کے ابا نے جواب دیا۔

"شاید یہ بات میں ابھی نہ کرتی۔ مگر کل نہ جانے کیا ہو جائے زندگی کا کیا بھروسہ۔ نہ معلوم میرے گھر کا دم نکال جائے۔" اور امی اکثر یہ فقرہ دہرا کر دوسروں کو ڈرایا کرتی تھیں۔۔۔ اور میں چاہتی ہوں کہ بات ابھی سے کہہ لی دوں۔ تاکہ میرے دل کو سکون مل سکے۔"

”میرے بہن کیا بات ہے؟ سالمہ کے ابا نے یہ کوسھیلا۔“

امی نے ابا کی طرف دیکھا اور بولیں۔

”میں سالمہ کو اپنی بیٹی بنانا چاہتی ہوں۔“

”تو بھلے ہی آپ کی بیٹی نہیں کیا؟“ سالمہ کے ابا نے کچھ نہ سمجھ کر کہا
ہمارے ابا سکھانے لگے۔ امی نے کہا۔

”میرے مطلب ہے میں نے مدت سے ارادہ کر رکھا ہے کہ سالمہ کو
اپنی بہو بناؤں گی۔ میری رحوم بہن کی آخری نشانی ہے۔ ہر وقت میرے سامنے

رہے گی۔ اور میرے دل کو سکون ملے گا۔ اور ماشاء اللہ سلیم بھی
بالکاجوان ہے۔ عقل مند اور پڑھنے میں تیز۔۔۔

آپ کا کیا خیال ہے؟“

سالمہ کے ابا کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر بولے۔

”جیسی آپ کی مرضی۔ مگر ابھی سے سارا اور سلیم کو اس بارے میں
معلوم نہ ہو۔“

”ارے کیوں؟“ امی نے کہا

”جب میں واپس آؤں گا۔ ان کی شادی کر دوں گا۔ مشکلی بچی
رہی۔ باقی نیری والی ہی پر۔۔۔۔۔“

سالمہ کے ابا بولے۔

”ٹھیک ہے۔“ امی نے جواب دیا۔

سالمہ اور میں ساتھ والے کمرے میں بیٹھی سب باتیں سن رہی تھیں

نامہ اپنے کمرے میں تھی۔ سالمہ کی آنکھوں میں جھک چیدا ہوئی
اور میں سن ہو کر رہ گئی۔ یہ کیا ہو گیا۔ نامہ کا کیا ہو گا؟
کیا اس کی قسمت میں زندگی کی خوشی نہیں ہو گی؟
امی کہہ رہی تھیں۔

”بھائی جان میں نہ بیٹھا تو مزید کراؤں گی۔“

جیسے آپ کی مرضی۔ سالمہ کے ابا نے جواب دیا۔

امی نے لٹو منگوائے اور سب نے کھائے بھیا اور

نامہ اس بات سے بے خبر تھے کہ یہ لٹو اس معاہدے کی خوشی
میں کھلائے جاتے ہیں۔ میں نے کوئی لٹو نہیں کھایا۔ سالمہ

جیسے معلوم تھا کہ میں اس کی راز دار ہوں۔ چپکے سے میرے کمرے
میں آئی اور بولی۔

”یہ تو تم بھی کھانا۔“

اور لٹو میز پر رکھ کر چلی گئی۔ وہ ضرورت سے زیادہ خوش

دکھائی دے رہی تھی نہ جانے اسے بھی بھیا سے کیوں پیار
ہو گیا تھا۔؟ بھیا کی مشکل صورت ہی ایسی تھی کہ لڑکیاں اس پر
مرنے لگتی تھیں۔

میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ میرا پر پڑا ہوا لٹو
میرا مذاق اڑا رہا تھا۔

غصے سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

مگر میں کچھ بھی نہ کر سکی۔ اور صرف دیکھتی ہی رہ گئی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں نامرہ کو کچھ بھی نہ بتاؤں گی۔ بلکہ سب کچھ حالات پر چھوڑ دوں گی۔ مگر میں نے ہمد کیا تھا۔ کہ میں نامرہ کی مدد کروں گی اور اس کے سپنوں کی حقیقت کا روبرو دوں گی۔ چاہے مجھے جان ہی دینی پڑے۔ مگر میں ایک کمزور اور بے بس لڑکی کیا کر سکتی تھی۔ میں مجبور تھی۔ ماں باپ مکے گئے ہوئے فیصلوں کو بدلنا میرے بس میں نہ تھا۔ اور پھر یہ تو مشرق کی ریت ہے کہ لڑکیاں ماں باپ کی زبان سے کئے گئے وعدوں کی مینٹ چڑھتی رہیں۔ میں کچھ بھی نہ سنو سکی۔ اور بستر پر لیٹ کر گردیں بدلنے لگی۔ بہت میری آنکھ لگ گئی

خواب میں میں نے سنا کہ کو ایک ڈائن کے روپ میں دیکھا وہ ۔۔۔۔ ایک خوفناک جنگلی ہیں ہم پر چھٹ رہی تھی۔ وہ نامرہ کو ہڑپ کرنا چاہتی تھی۔ مگر بھیا درمیان میں آگئے۔ اس نے بھیا کی مدافعت کے باوجود نامرہ پر چھٹا چاہا۔ مگر بھیا نے اسے زور سے دھکا دیا۔ اور نامرہ ایک گہرے کھڈ میں گر گئی خوف سے میرے منہ سے بلند چیخ نکل گئی۔ گھر کے سبھی افراد ڈر گئے۔ اور بھاگے بھاگے آئے۔ سب نے مجھ سے چیخ کی وجہ پوچھنے کی کوشش کی۔ مگر میں کیا بتاتی۔ امی نے کہا۔ ”ڈر گئی ہے۔ اب میرے کمرے میں آکر سو جا۔“

میں نے لپک کر لڈو اٹھایا اور پورے زور سے پائنتے مسل دیا پھر میں اپنی بے بسی پر خود ہی رورہی۔ اچانک نامرہ کمرے میں داخل ہوئی۔ ایک ہی نظر میں اس نے میری آنکھوں میں آنسو دیکھ لئے۔ اور بولی

”رہنہ ہیں کیا ہوا؟“

”میراجی اور بھرا کیا اور میں نے اسے بازوؤں میں سے کھینچ لیا۔ اور اس کا چہرہ میرے آنسوؤں سے تر ہو گیا۔

وہ حیران کھڑی مجھے دیکھ رہی تھی۔ آخر اس نے کہا۔ ”رہنہ ہیں آخر بات کیا ہے؟“

”بات کیا ہے؟“ میں نے دوبارہ۔ میں نہیں بتا سکتی۔ نامرہ ہیں مجھ سے نہ بوجھو تو اچھا ہے۔“

نامرہ خاموش ہو گئی۔ میرے دل کی بھر اس نکل گئی تھی۔ میں نے آنسو صاف کئے اور بولی۔

”نامرہ ہیں بس بونہی ذرا دل زدن کو چاہا اور رد لیا؟“ وہ حیران کھڑی مجھے دیکھتی رہی۔ اور پھر اپنے کمرے میں چلی گئی مجھے افسوس ہوا کہ میں نے خواہ مخواہ نامرہ کو کیوں پریشان کیا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں نامرہ کو سب کچھ بتا دوں۔ کہ تمہاری محبت کی نگہری میں ایک چور آن گھسا ہے۔ اور اس نے تمہاری زندگی کی سب سے بڑی پونجی تم سے چھین لی ہے۔

کچھ دلوں سے اداس اور اس سی ہے۔ نہ جانے کیا ہو گیا ہے
میری بچی کو؟
مجھے امی کی اس بات پر بھی بے حد غصہ آیا۔ میں نے
دل میں کہا۔

”اس کی وجہ تم جو امی میں نہیں ہو۔“

مگر زبان سے یہ فقرے ادا نہ کر سکی۔ اور امی کے کمرے
میں پہنچ گئی۔

دوسرے روز بیچ سائیکل کے ابا ہم سے رخصت ہو گئے
ہم سب الوداع کہنے آئے۔۔۔ سائیکل ابا سے رخصت ہو کر
اداس نہ تھی جیسے اما کا گھر اب اس کا اپنا گھر نہ ہو۔ نہ جانے
کیوں مجھے اس کی ہر حرکت پر غصہ آ رہا تھا۔

اور خواہ مخواہ سائیکل سے نفرت ہو گئی تھی۔ حالانکہ
جب میں نے غور کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ اس میں سائیکل کو کوئی
قصور نہ تھا۔ اس نے ماں باپ نے فیصلے پر سرخم کر دیا تھا
تب میں نے سوچا کہ مجھے سائیکل سے بات کرنی
چاہیے۔ اور اسے بتا دینا چاہیے کہ وہ اس گھر میں بہو کی حیثیت
سے داخل نہیں ہو سکتی

ناظرہ اور بھی ایک دوسرے سے بے پناہ پیار کرتے ہیں۔ اور
ایک دوسرے کے لئے زندہ رہنے اور ایک ساتھ مرنے تک کا

بہو کر چکے ہیں۔ آخر وہ عورت ہے وہ عورت کا درد جانے گی
اور ہر زور بھی اس کے راستے سے ہٹ جائے گی۔

پھر وہ آزاد خیال ہے ممکن ہے وہ غمخو شادی سے
انکار کر دے۔ اور اس طرح ایک مسئلہ جو خواہ مخواہ پیدا ہو گیا
تھا دور ہو جائے۔ چنانچہ میں مناسب موقع کی تلاش میں
رہنے لگی۔ اس دوران سائیکل بھی اسے کافی بے تکلف ہو گئی
تھی۔ ایک روز جب ناظرہ اپنے کمرے میں کام میں مصروف
تھی۔ بھیا گھر پر نہ تھے۔ میں سائیکل کو لے کر اپنے کمرے
میں پہنچی۔ اور دروازہ زور سے بند کر دیا

”کیا بات ہے کیا ارادے ہیں آپ کے؟“

سائیکل نے مسکرا کر پوچھا

”ایک اٹھائی غفیفہ بات کرنی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”کیا بات ہو سکتی ہے؟“ سائیکل نے پوچھا۔

”بیٹھ جاؤ۔“ میں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا

سائیکل بیٹھ گئی۔ میں نے پوچھا

”میں تم بھی اسے واقعی پیار کرتی ہو؟“

”اپنے ہونے والے۔۔۔ مجازی طور سے کون پیار نہیں کرتا

بڑا گا۔“ سائیکل نے جواب دیا

”مگر۔۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔۔ میں نے کہنا چاہا۔“

”ہاں ہاں کہو۔ کوئی اور لڑکی بھی ہے جو تمہارے بھیا کے دل میں بسی ہوئی ہے؟“

”ہاں میں نے جواب دیا۔ ایک اور بھی ہے۔“

”کون؟“ سالک نے تعجب سے پوچھا۔

”نامہ“ میں نے جواب دیا۔

”وہ چونک پڑی۔“ وہ بھوکی تنگی اور تنہائی لڑکی۔ جو اس گھر کے ٹکڑوں پر پڑی ہے اس کی یہ حال کہ اس گھر کی پونجی سمیٹ سے جاتے ہیں ایسا نہ ہونے دوں گی۔ سنو رینہ بہن۔ میں سلیم کو پسند کرتی ہوں۔ ابانے میری اور سلیم کی شگنی کر دی ہے اب یہ میری توہین ہوگی کہ سلیم کو چھوڑ دوں۔ میں مر سکتی ہوں سلیم کو نہیں چھوڑ سکتی نامہ کو میرے راستے سے ہٹا ہو گا۔ وہ غصے میں نہ جانے کیا کیا کہہ لگی۔

میں نے کہا

”مگر بھیا سے دل پر سکرانہ نہ کرے کوئی۔ اس دل

پر ہمیشہ کسی اور کا راج ہے لگا؟“

”آخر کیوں؟“ اس نے سوچ میں ڈوب کر سوال کیا۔

”اس نے نہ نامہ اور بھیا محبت میں بہت دور نکل چکے ہیں۔

نامہ اور بھیا بچن سے ایک دوسرے کو چاہتے ہیں

اور پیار ریت کا پہاڑ نہیں ہوتا جسے اتنی آسانی سے ڈھکا دیا جاتا

”میں اس پہاڑ کو زور و زور سے دوں گی۔ وہ بولیں۔

”اور تمہیں مواز ہو جائے گا کہ میں کیا کر سکتی ہوں۔“

میں سلیم کے سوا کسی پر فداؤں کی۔“

وہ پیر دل کو زور و زور سے زمین پر مارتی رہاں۔۔۔

پہلی گئی۔

اور یہ اپنی سوتیلوں میں گم رہاں سچی رہ گئی۔

~~~~~

مگر اب سائلہ سے اتنا زیادہ میل ملاپ تو اسے گویا کھا گیا  
اور وہ چپ چپ رہنے لگی۔ پہلے ہی اس نے کسی زیادتی پر کب  
احتجاج کیا تھا جو وہ اب کرتی تھکات پر ڈوری چھڑ کر خاموش ہو  
گئی۔ مگر میں بار بار ماننے والی نہ تھی۔ مجھے واقعی سائلہ ایک ڈانٹ  
مسلوم بھوتی تھی۔ ایک روز تو اس کی اور میری اچھی خامی لڑائی ہو گئی  
اگر اچھی نہ نکلت تو شاید روت مار پٹ تک پہنچ جاتی۔ اب وہ اس  
روز سے میں نے سائلہ کے خلاف باقاعدہ محاذ بنالیا۔

اس روز سائلہ بھی اکیس کھیل رہی تھی۔ بھیا اور سائلہ مار ٹھوٹھ۔ جبکہ  
نامرہ اور میں دوسری طرف بیٹھی۔

بھائی جان ہماری گیم دیکھ رہے تھے۔ جہنم کھیلے ہی نہ تھے  
کیل کے پلے اور ٹوٹے، ہم جیت گئے۔ مگر باقی سب ہوا ٹوٹ بھیا اور  
سائلہ نے جیتے۔ وہ کیم کھیلے میں ہم سب سے تیز تھی۔ جب وہ  
جیت گئی تو اس نے بھیا کی طرف دیکھا۔ اور پھر نامرہ کے سامنے  
ہاتھ پکارتا لی بجا دی۔ میرا دل جل گیا۔ میں اپنی منہ بولی بہن کی  
توہین برداشت نہ کر سکی۔ میں نے کیم کی ساری بازیاں سائلہ کے منہ  
پھونک دیں اور پھر کیم بورڈ کو زور سے زمین پر چٹا کر چلائی  
”تہیں نامرہ کی توہین کا کیا متی ہے۔ اپنے کام سے کام رکھا کرو  
دوسروں کے کام میں ٹانگ اڑانے یا بڑبسنے کی ضرورت نہیں ہے“  
”ارے ارے“ جانی جان نے کہا ”یہ تم کیا کرنے لگیں“

سائلہ نے اپنے خیال کے مطابق بھیا کے دل میں کھڑکرتا  
شرعاً کر دیا۔ وہ ہر وقت جب بھیا گھر میں ہوتے ان سے خوش  
رہتا۔ ان سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی۔ واثقات سناتی اور  
بھیا بھی جو حالات سے بے خبر تھے اسے ایک مہمان اور مثالہ  
نرا وہ بہن جہاں کر کے اس کا دل بوجھتے رہے۔ جس سے سائلہ  
نے یہ مطلب لیا کہ بھیا اس سے پیار کرنے لگے ہیں۔ اور نامرہ ان  
کے زیادہ میل ملاپ سے کچھ بھی سمجھنے لگی۔ اور یہ فطرتاً  
کل بھی تھا۔ بے چاری کا دل ٹوٹ کر رہ گیا۔ بھیا نے جانی جان کے  
مدد پر جو باتیں کی تھیں۔ نامرہ کو وہ بھی کھٹ ناگوار گزری تھیں۔



ایجاد کیا۔ اس نے ایک روز چپکے سے ایک خط لکھا اور نامہ کے نام ڈاک میں ڈال دیا۔ خط گھر میں پہنچا۔ تو سب سے پہلے وہ بھیا کے ہاتھ لگا۔ بھیا نے تمام اداب کو بلائے طاق رکھ کر خط کھولا۔ کیونکہ قہر کسی مرد کی لگتی تھی۔ اور نامہ کو کسی مرد کا خط کہاں سے آسکتا تھا جب انہوں نے خط کھولا تو وہ حیران رہ گئے۔ ایک نوجوان احمد کا خط تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

نامہ پیاری

کافی دنوں سے دکھائی نہیں دے رہی ہو میں سخت ادا سپروں اور تمہیں تو معلوم ہے کہ میں چند روز قہیر نہ دیکھوں تو میرے دل کو کچھ ٹھن گلتا ہے۔ اور نہ ہی تم نے کوئی خط لکھا ہے۔ میں کل صبح جہاں سے تم کا رخ بنایا کرتی تھیں۔

فائدہ سخی بس شاپ پر انتظار کروں گا۔ مگر ان کا رخ تو بند ہیں۔ مگر خدا کے لئے خط تو کھو۔

تمہارا اپنا

احمد

بھیا تو خط پڑھ کر ہنسنے سے کاپٹنگے۔ انہوں نے خط حبیب میں ڈال لیا۔ ان کے دل میں نامہ کے خلاف نفرت اور غصہ بھر گیا۔

انہوں نے نامہ سے بات کرنے کا فیصلہ کیا

شام کے وقت انہوں نے وقت نکالا۔ اور سب سے پہلی

ٹھیک کر رہی ہوں۔ میں نے جواب دیا۔

”رضیدہ ہوش گھر۔ بھائی جان کو منحرف لگا

”جی اسے بھی سمجھائیں۔ خود کو ناجائز کیا سمجھنے لگی ہے

”بڑی اتنی منسل والی۔ ساتھ نے جواب دیا۔

اور میں اس کی طرف اسے مائے کو پسلی مگر بھیا نے مجھے کچھ کر

لیا۔ اور پڑے بٹا کر بولے۔

”بہان کی عزت تو کرو رضیدہ بھائی۔“

میں نے نامہ کا ہاتھ پکڑا اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

میرا دل چاہا کہ نامہ کو بتا دوں کہ یہ لڑکی عنقریب بھیا کی زندگی میں داخل

ہونے والی ہے۔ مگر جب میں نے نامہ کے کپڑے کی طرف دیکھا تو حوصلہ

نہ پڑا۔ محسوس اور صاف دل نامہ مسکرا رہی تھی۔ اسے خوشی تھی کہ میں

نے اس کی طرف داری کر کے سب کے دل میں اس کی عزت بڑھا دی ہے

نامہ کو یہ خیال زیادہ حوصلہ دے رہا تھا۔ کہ اس کی دوا ایک بہن

اس گھر میں موجود ہے۔

اس روز سے سارے پیر دگر کم بنایا کہ نامہ پھر نشان کر کے

گئی۔ میرا وہ کیا بوجھڑ سکتی تھی۔ مجھے بھیا۔ جانی جان۔ ابا اور امی

بہن کی حمایت حاصل تھی۔ اور نامہ بے چاری کے دشمنوں کی تعداد

نیا دہ تھی۔ جبکہ ساتھ نے پہلے جادو اندازہ لگا دیا تھا۔ کہ امی نامہ

سے نفرت کرتی ہیں۔ ساتھ نے نامہ سے بدلے کے لئے اور طریقہ

میں اپنی حواشا کا تم اتنی مسکراؤ اور مر جائی ہو۔ ابد بول  
مجھے خراب اور بدنام کر دو گی۔ اور پھر اسی میں تمہارا ہی کیا قصور تم  
ایسا مزور کر رہی - مجھے یقین ہے - کہ تم مجھے بے وقوف بناتی  
رہی ہو۔"

”اسلم معاہدہ“ نامہ رد کر دیونی۔ ”بہوش کړو۔ کم از کم مجھ کو ایسے الزام تو نہ دو۔“

ایک دم بھیا کو میز پر بڑا سہاوا وہ غلط دکھائی دیا۔  
 جو ابھی نامرہ نے لکھا تھا۔ جیسنے اپک کردہ اٹھالیا۔ لکھا تھا۔  
 ”میر کے سرتاج !

یہ ٹھیک ہے میں اب آپ سے جنس مل سکتی۔ اور نہ ہی بات کر سکتی ہوں۔ مگر مجھے دل تو ڈر رہا کہ اب جسے آپ کا نام ملتی ہے۔ آپ کی محبت میرا ایمان بن چکی ہے۔ اور۔۔۔۔۔“  
خط ادھون تھا۔ اور کسی کانام نہیں تھا۔۔۔۔۔ بھڑا بھیجا غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے۔ انہوں نے کہا۔

"میں اس خط کو مکمل کر دوں۔"

"ہاں ہاں" نامرہ خوش ہو گئی۔

اس نے سمجھا شاید بھیا کا شک دور ہو گیا ہے۔

بھینس نے کہا۔

”نہرو کے کہنے پر مجھے  
”نہرو کے کہنے پر خوشی کی ہر دھڑکنی  
اس نے کہا

”آج چاند ادھر کیسے نکل آیا؟“

• مطلب کو بات کر دو۔ جیسا نے جواب دیا۔

وہی! "نعرہ چوک اٹھی۔ یہ کیا بات تھی۔ وہ تو بھیا کو خط لکھنے والی تھی اور اس نے خط کا مسودہ ابھی مکمل کر کے میز پر رکھا ہی تھا۔

سیدکو گھومیں، سرعام صبا اور نازہ کابلونگ اور ملنا جلتا بندر غلط۔

جسمانے کہا۔

تہمارے دوست احمد کا خط آیا ہے اس نے تمہیں کل  
صبح بس مشایب پر بلایا ہے۔

”جی کون احمد۔ کیسا بس سٹاپ“

نامہ نے گھبرا کر پوچھا :

”زیادہ ہو غیار بننے کی کوشش نہ کرو۔ یہ لو غلط“

اور پھر انہوں نے غصہ و فخر کی طرف رجوع کیا۔

نمبرہ نے خط پڑھ کر ایک لمبی سانس لی۔ اور بولی۔

”سلیم صاعب خدا کی قسم میں کسی احمد و غیرہ کو نہیں

جانتی یہ کسماندہ کہ سے خیر امت کی ہے ؟

”مشرقات! جیسا نے دوہرایا۔“ کسی اور سے مشرات کیوں

نامرہ نے مجھ پر ہنس کر دیکھا۔  
 ”ہاں یہ سارے کام شراکت ہے۔“  
 میں نے جواب دیا۔

”کھسو ہو۔۔۔۔۔ میں رات کے اندھیرے میں تمہارے  
 اتنے فرار ہونے کو تیار ہوں۔ سلیم کو تو میں بے وقوف  
 بتاتی رہی ہوں۔“

میں نے میرا جسم کانپ رہا تھا۔ اور دل چاہتا تھا کہ سارے  
 کام نہ نونچ لوں۔ اور اپنے بھائی کو بھی خوب دانا کھانے بڑا  
 کھلا ہوں۔ پھر مجھے خیال آیا۔ بھیا کا کیا تصور ان کی جگہ اور کوئی  
 کر دیتی ہوتا۔ تو وہ بھی یہی کچھ کرتا۔ جو بھیا نے کیا۔ میں تیزی  
 سے نامرہ کے کمرے سے نکلی۔ اور بھیا کے کمرے میں چلی گئی۔  
 بھیا کرسی پر اداس اداس سے بیٹھنے لگا۔ ان کے چہرے  
 سے یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے ان کی کوئی قیمتی چیز کھو گئی ہو۔  
 میں نے کہا۔

”کیا بات ہے بھیا تم اتنے اداس کیوں ہو۔؟“

”کوئی بات نہیں، وہ بڑے ”جادو اپنا کام کرو۔“

”دیکھو بھیا۔“ میں نے کہا۔ ”میں تمہاری بہن بھی ہوں  
 اور راز دار بھی۔ مجھ سے جو بات چھپاؤ گے وہ خود ہر  
 ظلم کرو گے۔“

”ظلم ہونے دو۔ وہ بڑے۔ آواز میں پکپکا ہٹ شامل تھی۔  
 میں نے ان کی دلی کیفیت کا اندازہ لگایا۔ اور پاس ہانک کر  
 ان کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ پیار سے میں نے کہا۔

اور اس سے پہلے کہ نامرہ کوئی جواب دیتی۔ بھیا اس کے  
 کمرے سے چلے گئے نامرہ روٹنے لگی۔ اس نے رورور کو برا  
 حنا کر لیا۔ اچانک میں ادھر آنکلی۔ اس نے نامرہ کو دوستے  
 دیکھا تو مجھے آکر بتایا کہ نامرہ رو رہی ہے۔ میں اس کے کمرے  
 میں گئی۔ اور جبہ پوچھی۔ اس نے بتانے سے انکار کر دیا  
 جب میں نے مجبور کیا اور تسلیاں دیں۔۔۔۔۔ تو اس نے وہ  
 خطا جو بھیا اس سے لے گئے تھے۔ اس کے سامنے چھینک دیا  
 اور ساری باتیں جو بھیا کے اور اس کے درمیان ہوئیں تھیں بتا  
 دیں۔ میں نے خطا پڑھا ساری بات میری سمجھ میں آگئی۔  
 یہ خط ضرور سارے کی شراکت ہے۔ اس نے بھیا اور نامرہ  
 کے درمیان دیوار بننے کے لئے یہ خط لکھا ہے۔ میں نے کہا۔  
 ”نامرہ رو دنا بند کر۔“ میں بھیا سے بات کر دوں گی۔  
 مرد تو بے حد شکی مزاج ہوتے ہیں۔ بھیا کو بھی شک ہو گیا ہے  
 میں ان کا شک دور کر دوں گی۔ اور ان کو اس خط کی حقیقت  
 سے آگاہ کر دوں گی۔  
 ”تو یہ خط کسی نے شراکت سے لکھا ہے نا باجی۔“

”میں تمہاری بہن ہوں کیا۔ اپنا دکھ مجھے دے دیا کرو۔ میں نہیں تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی۔“

بہن کے منہ سے ہمارے اظہارِ سن کر بھیا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ مگر ان کے پاس اظہارِ غم نہ تھے۔ کہ وہ نامرہ کی بات بتاتے۔ آخر میں سے ایسی بات کی بھی کیے جاتی۔ آخر میں نے خود ہی کہا۔

”بھیا میں جانتی ہوں کہ نامرہ کے نام آنے والے خط تمہیں اور تمہارے اعتماد کو زبردست ٹھیس پہنچا رہی ہے۔“

”ہاں ہاں“ بھیا جلدی سے بولے۔ ”اُسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تمہارے جو بہن۔“

”اُس نے ایسا نہیں کیا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”یہ خط اس نے انتقام لینے کے لئے لکھا گیا ہے۔ اور بھیا یقین کرو نامرہ صبح کی شبنم کی مانند پاکیزہ اور پھول کی طرح معصوم ہے۔ وہ ایسی باتیں جانتی ہی نہیں۔“

”رمیہ“ بھیا نے کہا۔ ”تم یہ کیسے کہہ رہی ہو۔“

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں جیسا“ میں نے جواب دیا۔

”میں تمہاری بہن ہوں۔ میرے جسم میں تمہارا خون ہے۔ میں

تمہاری عزت کی امین ہوں۔“

”خوب“ بھیا بولے۔ ”بھلا نامرہ سے کسے دشمنی ہو

سکتی ہے؟“

”ہے“ میں نے جواب دیا۔

”مگر کون ہے وہ؟ مجھے بتاؤ۔ میں اس سے ابھی بدلہ لوں

گا۔ جو اسے بدنام کرنے پر قائل ہوا ہے۔“ بھیا نے غصے سے پوچھا

میرا دل چاہا کہ ساڑ کا نام لے دوں۔ مگر میرے منہ نہ کھلیا۔ اور خاموش رہنے ہی میں عافیتِ خیال کی۔ میں نے کہا۔

”مڑکیوں کی باتیں مڑکیوں تک رہنے دو۔ بھیا ہر حال نامرہ سے

نہ کسی لڑکے کا تعلق ہے۔ اور نہ ہی واقعیت اور آپ کو چہ

ہے کہ اسے اتنا وقت ہی کب ملتا ہے۔ وہ کالج بھارتیہ ساتھ

جاتی ہے۔ مگر میں سب کے سب نے جوتی ہے۔ پھر سے ملاقات

کا کون سا وقت مل سکتا ہے؟“

”ٹھیک ہے۔“ وہ بولے۔ ”شاید میں نے نامرہ سے

زیادتی کی ہے۔ میں نے اسے بہت سی باتیں کہیں تجھیں۔“

”تو آپ کو اس سے معافی مانگنی ہو گی۔“

میں نے کہا۔

”ہاں کوئی حرج نہیں۔“ بھیا نے جواب دیا۔ ”مجھ کو تم جاؤ

میں خود اس سے معافی مانگ لوں گا۔“

میرا کام ختم ہو چکا تھا۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھ گئی۔

نامرہ اب خاموش خاموش کرسی بیٹھی تھی۔ اور غلامیں  
گھور رہی تھیں۔ میں نے ازارہ لگا لیا جیسے وہ کسی فیصلے پر  
پہنچنے کے لئے سمٹ رہی ہو۔  
اور پھر ایک گھنٹے کے بعد میں نے دیکھا۔ بھیا گلاب کا  
سرخ پھول اپنے مخصوص انداز میں لے ہوئے نامرہ کے کمرے کی  
طرف سہا رہے تھے۔ سرخ گلاب کا پھول ان کے ہاتھ میں  
کھتا اچھا لگتا تھا۔ میں نے سوچا ابھی جب وہ نامرہ کے بالوں  
میں پھول لگا کر جائیں گے۔ تو اس پھول کو میں جو انوں لگی  
گھر یہ کیا۔ ؟۔ اچانک ساٹھ ان کے راستے میں آگئی۔  
اس نے کہا۔

”یہ پھول کس کے لئے لائے ہو، آپ؟“  
”یہ پھول؟“ بھیا گھبرا گئے۔ وہ نامرہ کے کمرے کے بالکل  
سامنے کھڑے تھے۔ اور نامرہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔  
بھیا نے کہا، ”آپ کس لئے؟“  
”اٹ کھانا بڑا اور خوبصورت پھول ہے“ ساٹھ نے کہا۔  
”لاؤ میرے بالوں میں لگا دو۔“

بھیا کیا جواب دیتے۔ ساٹھ نے اپنا سر بھیا کے سامنے  
کودیا۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ پھول کس کے لئے لایا گیا ہے۔  
بھیا ایک منٹ کے لئے بڑبھکی۔ اور پھر انہوں نے ساٹھ کے  
”ہوں۔ اس کا فیصلہ تو وقت کرے گا کہ اس گھر  
کی مالک کون ہے۔“ ؟ وہ آہستہ سے بولی۔  
”دیکھا جائے گا۔“ میں چلائی۔ ”اس سے پہلے  
میں تمہارا خون پی جاؤں گی۔“

بھیا نے اپنے سر بھیا کے سامنے  
کودیا۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ پھول کس کے لئے لایا گیا ہے۔  
بھیا ایک منٹ کے لئے بڑبھکی۔ اور پھر انہوں نے ساٹھ کے



کہتے تھے میں نامرہ سے معافی مانگ لوں گا۔ میں نے کہا۔  
 "اور وہ تم سے معافی مانگے اور تمہارے بانوں میں پھول  
 رکھنے آئے تھے۔ وہ خاموش رہی میں نے کہا۔  
 "تیس پتہ ہے وہ خط کس نے لکھا تھا؟"  
 "تہیں تو۔۔۔ وہ بولی۔

"سانہ نے"۔۔۔ میں نے جواب دیا۔  
 "مگر کیوں؟ اسے مجھ سے کیا دشمنی ہے؟ اس نے پوچھا  
 "دشمنی کیا ہو گی؟ میں نے جواب دیا۔ "وہ تمہیں اپنے مائے  
 لاپتہ خیال کرتی ہے۔  
 "مگر کیوں؟ نامرہ نے کچھ نہ کہا۔

"اس لئے کہ وہ بھی اپنا سفر مکے ہوئے ہے اور وہ چاہتی  
 ہے کہ بھیجا کو اپنا لے۔" میں نے کہا۔  
 "کیا کہا۔ نامرہ نے یہ الفاظ ہوں ادا کئے جیسے اسے  
 بجلی کا جھکا لگ گیا ہو۔ میں نے کہا۔

"نامرہ حوصلے اور صبر سے کام لو۔ تمہیں معلوم ہے کہ  
 امی اور ابانے بھیجا اور سانہ کی سنگنی کردی ہے۔"  
 میں نے اسے سب بتا دیا

"کب؟" اس نے مردہ آواز میں کہا۔  
 "اس روز تم نے لڑو کھائے تھے نا؟ میں نے پوچھا۔

"ہاں۔" نامرہ نے جواب دیا۔  
 "وہ بھیجا کی سنگنی کے لڑو تھے؟ میں نے بتایا  
 "نامرہ کا رنگ سرخ ہو گیا۔ وہ مردہ سی ہو گئی۔ اور بولی۔

"مگر یہ بات مجھ سے کیوں چھپائی گئی؟"  
 "اس نے بھیجا اور تہیں احتیاطی امی اور ابانے  
 بات تب تک نہ بتانا چاہتے تھے۔ حسب تک سامعہ کے بنا  
 واپس نہ کھائی۔ میں نے بتایا۔  
 "اور آپ کو کیسے پتہ چل گیا؟ نامرہ مکہ کی تھی۔ اس نے  
 رد ہنسی آواز میں پوچھا۔

میں نے خود اپنے کانوں سے ابا۔ امی اور سانہ کے ابا کی  
 باتیں سننی تھیں۔ ابا امی نے سانہ کا رشتہ بھیجا کے لئے  
 مانگا تھا۔ اور بھیجا سانہ کے ابا کو پسند کرتے۔ انہوں نے ہی  
 کردی۔

میں نے بتایا۔  
 "نامرہ خاموش ہو گئی میں نے کہا۔  
 "نامرہ تم حالات کا مقابلہ کرو۔ میں بھیجے سے بات کرتی ہوں  
 امی تو تمہارے خلاف خواہ مخواہ ہیں۔ مگر ابا اور بھیجا امی  
 تمہارے سامنے ہیں۔ پھر بھیجے تمہیں چاہتے ہیں۔  
 "نامرہ تم مشرقی زبان کی ہو۔ تم اپنی زبان نہ لادو گی۔ مگر بھیجا تو

مرد ہیں۔ وہ اپنی پسند اور ناپسند کا اظہار کر سکتے ہیں۔ میں ان کی بہن ہوں۔ میں انہیں سناؤں گی۔ کہ وہ دو ٹوک بات کریں اور شادی سے انکار نہ کریں۔

”مگر وہ بھی شاید سارے کو پسند کرنے لگے ہیں۔“

نامہ رو لائسی آواز میں بولی۔

”بہن نامہ۔ وہ کسی کو پسند نہ کرتے۔ اور صرف تمہیں چاہتے ہیں۔ اور۔۔۔۔۔۔“

”اس روز انہوں نے میرے سائے کے بالوں میں بھول

لگایا تھا۔“

نامہ نے جواب دیا۔

”انہوں نے نہیں لگایا تھا۔ بلکہ ان سے لگایا گیا تھا۔“

میں نے جواب دیا۔

”نامہ خاموش غلا میں گھورتی رہی۔ بیوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے جسم سے خون کا آخری قطرہ بھی چھوڑ دیا گیا ہو۔ وہ بے حد غار مندی تھی۔ میں نے کہا۔“

”نامہ تم امینان رکھو۔ میں جان دے دوں گی۔ مگر تمہیں تمہاری منزل دور نہ ہونے دوں گی۔“

”اتنے میں بھائی جان آ گئے۔ انہوں نے کسی کا

موت بھی نہ دیکھا کہ وہ خود موت میں تھے۔ انہوں نے کہا۔“

”رہنمہ۔ نامہ بھی تیار ہو جاؤ۔ ہم سب بیچ پانچ پر جائیں گے۔ چھانٹے مانگے کے جنگل میں ڈرامہ ہو جانے گی۔ تمہاری بھابی کا خیال ہے کہ بچوں کو چھٹیاں ہیں۔ خوب مزہ رہے گا۔ اور سیر بھی ہو جائے گی۔“

”اور کون کون جائے گا؟ میں نے پوچھا۔“

”سلیم۔ تم۔ نامہ منی۔ سائے۔ تمہاری بھابی اور میں سب جائیں گے۔ امی اور بابائیں جائیں گے۔ ویسے بھی ایسے پروگراموں میں بزرگ حضرات سارا مزہ کر کر کر دیتے ہیں۔“

بھائی جان نے ایک ہی سانس میں کہہ دیا۔

”اچھا ہم تیار کی کرتی ہیں۔“

میں نے جواب دیا۔ اور بھائی جان کمرے سے باہر

نکل گئے۔

بھیا کے قو آج کل پروگرام ہی عجیب ہوتے تھے۔ وہ سارا سارا دن گھر سے باہر رہتے۔ امی ابا اور بھائی جان اکثر ان سے باز پرس کرتے مگر بھیا کوئی نہ کوئی بہانہ بنا لیتے۔ وہ ہمیشہ کہتے۔ میں کرکٹ کی مشق کرنے جاتا ہوں۔“

اور سچ جانتے تھے۔ کہ کرکٹ کھینے کا شوق بھیا کو بے

حزب۔ شام کو بھیا کے قلم میں لایا گیا۔ کہ وہ بھی پانچ

پر سافٹ جائیں گے۔ گیارہ بجائے کہا۔



جنگل میں سیر بھی خوب رہی۔ بھائی جان کا شوق بھی عجیب تھا وہ جنگل میں اگر شکار کرنے کے عادی نہ تھے۔ انہوں نے کہا۔  
 "مہم تم لڑکیوں کو لے جاؤ تمہاری بھابی نے تم کی وجہ سے زیادہ دور نہ جاسکے گی۔ میں ان کے ساتھ ٹھہرتا ہوں۔ اور دیکھنا زیادہ دور نہ نکل جانا۔ ورنہ راستہ بھول جاؤ گے۔"  
 "بہتر بھابی جان۔" بھیا نے جواب دیا  
 اس لائن کے ساتھ ساتھ راستہ نہ ہنا۔ بھائی نے مشورہ دیا  
 ورنہ راستہ بھول گئے تو معیت پڑ جائے گی۔ لائن کم از کم نشانی تو رہے گی۔  
 "بہتر۔ ہم نے کہا۔"

اور بھیا کے ساتھ سیر کو نکل پڑے۔ ہنستے مسکراتے ہم کافی دور نکل آئے سیر بھیاں تھا کہ میں اس موقع سے فائدہ اٹھاؤں اور ناصرہ و سائرہ کی موجودگی میں بھیا کو ساری بات بتا دوں اور دو لوگ فیصلہ کروا دوں چنانچہ جب ہم بھائی جان اور بھابی کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تو میں نے کہا۔  
 "بھیا ہم قومیت شک کئے ہیں۔ ہم مزید دور نہیں جاسکتے۔"

"خفک ہے۔" بھیا نے جواب دیا۔ "اُداس صاف جگہ کچھ دیر ریسٹ کریں۔"

"مجھ نہیں میں نہ جاسکوں گا۔ کیونکہ کل تو میرا منہ ہونے والا ہے۔ کوئی بات نہیں۔ بھابی جان نے کہا۔ تم پر وہ گرام میں تو رہی کرو۔ ہم تو فوراً جانیں گے۔ اور تمہیں ہمارے ساتھ جانا ہوگا کیونکہ میں اکیلا اتنے بڑے خانہ دان کو نہیں بٹھال سکوں گا۔"  
 بھیا بھائی جان کی بات ٹال نہ سکے اور بولے۔  
 "خفک ہے۔ آپ کا حکم ہے تو فوراً چلوں گا۔"

میں نے محسوس کیا کہ بھیا دانستہ ایسے کام سے کتراتے ہیں جس میں انہیں گھر پر ذمہ داری سونپی جائے۔ پھر وہ کچھ عرصہ سے ناصرہ اور سائرہ کے چکر سے بے نیاز بھی ہونا چاہتے تھے۔ وہ زیادہ سے زیادہ گھر سے باہر رہنا چاہتے تھے۔ تاکہ مسئلہ پیدا ہی نہ ہو۔ چنانچہ انہوں نے انہوں نے منہ پر کایا تھا۔ اور اب بھیا انہیں جانے کے لئے مجبور کر دیا تھا۔ ساتھ بے حد خوش تھی۔

اور مجھے کوئی وقت نہ مل سکا کہ میں بھیا سے کھل کر بات کرتی۔ پھر وہاں میں نے پکتاب میں ہی بھیا سے بات کرنے کا فیصلہ کیا میں بھیا کو بہن کی حیثیت سے اپنی بات منوانے کا فیصلہ کر چکا تھی۔ اور مجھے امید تھی کہ بھیا میری بات رد نہ کریں گے۔

دوسرے روز بھیا نے کسی دوست سے ایک پیپ کاڈ مانگی۔ اور ہم اس میں سوار ہو کر چپا گئے مانگے روانہ ہو گئے۔

واپس نہ آئے تو میں نے کہا -

"ناصرہ ہمیں بھی چلنا چاہیے۔ نہ جانے وہ دامن  
بھیا کو کیا بٹی پر صبار ہی ہوگی۔"  
ناصرہ نے کہا -

"تم منی کو ساتھ لے جاؤ۔ اور اپنی تلاش کرو۔  
میں یہیں بیٹھوں گی۔" ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی کوئی قیمتی  
چیز غم ہو گئی ہو۔ میں نے کہا -

"جنگل میں دیوں کیلے بسے رہنا درست نہیں۔ آؤ ہم  
سب دیکھیں خدا کا کمرے ان کے دشمنوں کو کوئی حادثہ نہ  
بیش آگیا ہو۔"

ناصرہ بھی چلا دی کچھ ہی دور میں بھیا اور سائے کی  
آواز سنائی دی۔ ہم دبے پاؤں چلتے اس طرف بڑھے۔ بھیا  
اور سائے ایک درخت کے نیچے بیٹھے تھے۔ مگر اس انداز میں کہ  
خود بخود یہ انہوں نے کھول رکھا تھا۔ وہ بھیا کی ٹانگ پر سر ٹکائے  
بیٹھ تھے۔ اور بھیا ناگوار سی سے پٹختے تھے۔ اور پھر جب  
میر نے غور سے دیکھا تو میر انہوں نے کھول رکھا تھا۔ سائے کے  
بالوں میں ایک بڑا جنگلی پھول لگا ہوا تھا۔ میں نے  
منی سے کہا وہ پرے کھڑی رہے۔ اور خود ذرا قریب کھسک  
گئی۔ اور ان کی باتیں سننے لگی۔ ناصرہ بھی قریب کھسک آئی۔

چنانچہ ہم اس جگہ بیٹھ گئے کچھ دیر بعد سائے نے کہا  
"بھئی یہ بھی کوئی بات ہے کہ میر کا مزاکرہ کر دیا جائے"  
"اپنا اپنا مزاج ہے۔" میں نے تلخی سے جواب دیا  
"تو یہ ہے۔" وہ بولی۔ "رضیہ بہن تو بروقت آنکھیں  
ہی نکالتی رہتی ہیں۔"

پھر کچھ دیر خاموشی رہ کر وہ خود ہی بولی -  
"اگر سلیم صاحب ذرا ہم آگئے ہی گھوم آئیں۔"  
"بھئی اکٹھے ہی چلیں گے۔"

"بھیا نے بے دلی سے کہا۔ وہ جلتے تھے کہ یوں  
سائے کے ساتھ جانے سے ناصرہ کو دکھ ہو گا۔ مگر سائے نے بھیا  
کا ہاتھ پکڑ لیا اور گھسیٹ لے چلی۔ کچھ دور جا کر اس نے ہاتھ  
ہلایا۔ بیٹھے وہ ہمیں الوداع کہہ رہا ہوا اور بولی -  
"خدا حافظ۔ ہم ابھی آتے ہیں ذرا جنگل کا  
یہ رخ بھی دیکھ لیں ادا اس نہ ہونا۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں چھپی ہوئی وہ  
چمک دیکھی جو فتح مندی اور احساس برتری کا نشان خیال کی  
جاتی ہے۔ مگر میں کیا کر سکتی تھی۔ میں خاموش رہی۔  
اور وہ چلے گئے۔

کافی دیر گزرنے کے بعد جب بھیا اور سائے

بھیا کہہ رہا ہے۔ "سارے میں تمہاری عزت کرنا پسند کیونکہ مجھے احساس ہے کہ تو بڑا اور میرا کیا بہتر ہے۔"  
 "اسی رشتے کی تو بات کر رہی ہوں؟ سائلہ نے بھیا کی بات کو دوسرا رنگ دے کر کہا۔ "اور اس وجہ سے کہتی ہوں کہ آپ گتے اچھے ہیں۔"

"اور تم بھی تو اچھی ہو۔ بھیا نے جواب دیا۔  
 "کہو واقعی میں آپ کو اچھی لگتی ہوں؟" سائلہ نے کہا۔  
 "بھئی چلو پیلیس؟" بھیا نے بات پلٹ دی۔ "لڑکیاں انتظار کر رہی ہوں گی؟"

"نہیں پیسے جواب دیں۔ کیا واقعی میں آپ کو اچھی لگتی ہوں؟" سائلہ نے پوچھا۔

بھیا کچھ دیر کے پھر کوسے۔  
 "اچھی نہیں تو کیا بڑی لگے گی؟"  
 "یہ آپ کا حق نہیں ہے؟" سائلہ نے مسکرا کر بھیا کی آنکھوں پر جھانک کر جواب دیا۔

"چلو اب چلیں؟" بھیا نے اس کا سراپا تانگ ہڈ سے پکڑے ہاتھ کر کہا۔

"اگلی؟ وہ بولی۔"

اس کا دل بھیا کو پھوڑنے کو تیار تھا

تھا۔ ایک لمحہ کے سچے مجھے اس پر ہوا لگتا۔ افسوس بھی رہے بھیا کو کتنا چاہتی تھی۔ مگر ناصرو کے فیصلے نے میرے دل گتے کھڑے کر دیے۔ اور میں بننے سے پہلے تھا بڑا ہو گئی۔  
 اور اچانک سائلہ نے اگلی ہاتھ دیا۔

"تو آپ یہاں ہیں؟"

"ہاں ہاں۔" بھیا نے جواب دیا۔ "سائلہ ٹھٹ گئی تھی اور ذرا آرام کرنے لگی۔"

"پیر آؤ اگلی کا طریقہ نہیں بھیا۔" میں نے سبیل کر جواب دیا۔ "آپ کیوں اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ آپ ایک جوان ہیں کے بھائی ہیں۔ اور نہیں اکثر بھائیوں نے سبق لیا کرتی ہیں؟"

بھیا چونک پڑے۔ اور بے حد خرمندہ آواز میں کہا۔  
 "بھئی بہن مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی کیا؟"  
 "نہیں آپ تو میری خانہ بڑے آگے لگے۔"  
 میں نے کسی قدر پیچ کر جواب دیا۔

بھیا خاموشی خلا میں گھومتے رہے۔ میرا غصہ غریب پر تھا۔ ناصرو اور منی خاموشی ایک طرف کھڑی تھیں مٹھنے آگے بڑھ کر سائلہ سے کہا۔

"ہم شریف لوگ ہیں۔ اور شریفوں کی طرح رہنا جانتے ہیں"

”رمیہ بہن تم نے سب کا موڈ خراب کر دیا سزاوارہ خواہ جسے مگر  
مولے لیا۔ اور یہ پھول تم نے پاؤں تلے کیوں روند ڈالا  
”اس پھول کا حق دار کوئی اور تھا۔“ میں نے جواب دیا  
”اور پھر پھولوں کو پاؤں تلے روندنا تو مردوں کا شیوہ  
ہے۔ میں نے عدت بن کر ایک بے جان پھول سسل دیا۔ تو  
کیا قیامت آگئی۔ آپ اہمیان رکھیں بھرے جنگل اور  
گلستان میں پھولوں کی کمی نہیں ہوا کرتی۔“

بھیا میری باتوں میں چپے ہوئے انشردن کی جھین  
محسوس کرتے رہے۔ اور خاموش رہے۔ میں نے اندازہ  
لگایا کہ وہ سائلہ کی بے عزتی سے کسی قدر خوش تھے۔ جیسے یہ۔  
سب ان کی مرضی کے مطابق ہوا ہو۔ اور نامہ۔ وہ بھی خاموش  
خاموش تھی۔ اور اس نہیں۔ بلکہ اس کے بھرپور ہونے  
کے اشارے تھے۔ اور وہ بھیا کو گھور رہی تھی۔

میں نے بھیا کی طرف غور سے دیکھا وہ رنجیدہ تھے  
جیسے ان کی بے عزتی کو دسی گئی ہو۔ مجھے نہ معلوم کیوں بھیا  
بجور دکھائی دیئے۔ میں جذبات سے منسوب ہو گئی۔  
اور مجھے بھیا پر بے اختیار پیار آگیا۔

میرے بھیا بھی تو کتنے بھولے تھے۔ اور میں بھیا سے  
پٹ گئی۔ مجھے معاف کر دو بھیا۔ میں نے کہا۔ میں جو چاہتی ہوں۔

آپ کو شرفاً نظر لیجئے اپنا نے ہوں گے۔“  
”ورنہ۔۔۔۔۔۔ سائلہ نے پوچھا۔“

”ورنہ میں اس کا علاج جانتی ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔  
”یاد رکھو میں سلیم کی بڑی بہن ہوں۔ اس گھر میں کوئی  
ملازم یا مہمان نہیں۔ میں اپنی عزت اور اپنے بھائیوں کی عزت  
کی حفاظت اپنا ایمان خیال کرتی ہوں۔“  
”مجھ سے کوئی فعلی ہوئی ہے کیا؟“

بھیا نے مخصوص انداز میں سکڑ کر پوچھا۔ ان کا خیال تھا۔  
کہ ان کی سکڑا ہٹ سے میرا غصہ دور ہو جائے گا۔  
مگر میں نے اپنا منہ تبدیل نہ کیا۔ اور بولی۔  
”بھیا آپ خاموش ہی رہیں تو زیادہ بہتر ہے۔ میں آپ  
سے پھر کسی وقت بات کر دوں گی۔“

سائلہ یوں خاموش تھا۔ جیسے اسے سانپ سونگھ گیا  
ہو۔ میں نے آگے بڑھ کر سائلہ کے بالوں میں لگا ہوا جنگلی پھول  
مٹھی میں دلچسپ لیا۔ اور اسے پاؤں تلے سسل دیا۔ مجھے سائلہ  
پر بے حد غصہ تھا۔ اور سائلہ بھی کسی سوج میں ڈوبی ہوئی تھی  
وہ خلاف معمول خاموش خاموش سی تھی۔ میں نے  
محسوس کیا کہ اس کی یہ خاموشی ہی کچھ کم خطرناک نہیں ہے۔  
بھیا نے کہا۔

اس کا آپ کو اندازہ بھی ہے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ میں بے  
تابو ہو گئی تھی۔

کوئی بات نہیں۔ بھیا نے میری گال پر ہلے سے جھپٹ  
لگا کر کہا۔

اور پھر ہم واپس آ گئے۔ مگر سب خاموش تھے۔ ذرا  
سے بات نے جو دراصل بہت بڑی بات تھی سب کا موڈ خراب  
کر دیا تھا۔

بھائی جان نے کہا: بڑی دیر گزری۔ کیا سیر میں وقت  
کا بھی خیال نہ رہا؟

اب ان کو کیسے بتایا جاتا کہ سیر کس نے کی ہے۔ وہاں  
تو ڈرامہ ہی اور کھیلا جاتا رہا ہے۔ مگر ہم نے کہہ دیا۔

”پانی بھائی جان خوب رہی۔“

پھر ہم نے مل جل کر چائے تیار کی۔ ہلکا سا ناشتہ کیا۔  
بھائی جان نے کہا۔

”اب چلنا چاہیے کیسے راستے میں اندھیرا ہی نہ ہو جائے؟“  
ہم نے سامان سہاڑا۔ اور واپس مدانہ ہو گئے۔ مگر ہمارا موڈ  
سیر سے اور زیادہ خراب ہو گیا۔ اس کی وجہ سامنے تھی۔

اور میں وہ رہ کر سامنے کو دیکھ رہی تھی۔ جو نہ جانے کیا میوٹھ  
رہی تھی نہ پتھر نہ لکڑی۔



وقت گزرتے دیر نہیں، — اور وقت گزر رہی جاتا ہے

مگر باتیں یاد رہتی ہیں۔ مجھے اب بھی وہ دن یاد ہے۔ سب میں نے  
بھیا اور ناصرہ کی ہجھک دور کرنے کے لئے اپنی خدمات پیش کی  
تھیں اور اب یہ بھی میرا ہی فرض تھا کہ میں بھیا اور ناصرہ کو دوسب  
کچھ بتا دیتی جو مجھے معلوم تھا اور بھیا کی مرضی معلوم کرتی تاکہ مگر میں  
بڑوں کے خلاف ایک محاذ کھولا جائے۔ اور ناصرہ کو اس کا حق  
دلایا جائے۔ چنانچہ اگلے روز ہی ایک جگہ کام سے گئیں۔ بھیا نے  
مجھے کو سلا رہی تھیں۔ سارا اسی کے ساتھ گئی تھی۔ ناصرہ گزرتے

روز سے تھکی ہوئی تھی۔ اس لئے مورہ ہی تھی۔ منی بھابی کے ساتھ  
 تھی اور بھیا گھر پر موجود تھا۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھے کوئی کتاب  
 پڑھ رہے تھے۔ آج وہ خلاف معمول نہ جانے کیوں گھر پر موجود  
 تھے۔ میں نے ان کی موجودگی اور ماحول کو غفلت جانا اور ان  
 سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ میں ان کے کمرے میں گئی۔  
 میں نے کہا۔

”بھیا میں تم سے ایک چیز مانگنے آئی ہوں۔ وعدہ کرنا نہیں کرو گے  
 ”اری۔“ بھیا بولے۔ ”بھلا تم کو بھی وعدہ لینے کی ضرورت ہے  
 تو میری کہہ رہی ہے۔ جہاں جی مانگو گی تو دے دوں گا۔“ میں خوش  
 ہو گئی۔ عجب اپنے بھائی کو اس پر جو مان تھا بھیا نے اس کی ابرو رکھ لی تھی  
 ”بھیا پتہ ہے گھر میں تمہارے خلاف کیا سازش ہو گئی ہے؟“  
 ”سازش اور میرے خلاف۔“ بھیا چونکا کر بولے۔ ”کس نے کی  
 ہے یہ سازش؟“

”امی اور ابا نے۔“ میں نے اطمینان سے جواب دیا  
 ”ارے امی اور ابا کیا سازش کر سکتے ہیں؟“ بھیا نے مسکرا  
 کر کہا۔

”بھیا سنو گے تو خوش ہو جاؤ گے۔“ میں نے تمن بھری مسکراہٹ  
 کے ساتھ بتایا۔  
 ”بھئی اب بتا دیجیے نا؟ وہ تیزی بولے۔ ”کیا کیا بنیاں ساز رہی ہو؟“

”اوسنو“ میں نے گلا حاف کر کے کہا۔ ”امی اور ابا نے سامنے کے  
 ابا سے آپ کا رشتہ مانگا ہے اور سامنے کے ابا نے یہ رشتہ دینا منظور کر  
 لیا ہے۔ کافی دن ہونے پر یہ بات حقیقت مکمل ہو گئی ہے۔“  
 ”رضیہ۔“ بھیا چلائے۔ ”تم یہ کیا کہہ رہی ہو؟“ میں خوش ہو گئی  
 تو بھیا کو اس کا علم نہیں۔ اور سامنے سے بھی پیار نہیں۔ ان کا اضطراب  
 اس بات کا گواہ تھا۔ میں نے کہا۔

”اس روز گھر میں سب کو لٹو کھلائے کئے تھے۔ اور  
 امی نے تمہیں اپنے ہاتھ سے لٹو کھلایا تھا۔ یا رہے نا؟“  
 ”ہاں۔“ بھیا نے یادداشت پر زور  
 دے کر کہا۔

”تو وہ لٹو اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ بھیا تمہاری مرضی  
 کے خلاف تمہاری ہلکی کر دی گئی ہے۔“ میں نے کہا۔  
 ”کر سکتے کیوں نہیں بتایا گیا؟“ بھیا نے کہا۔

”آپ کو چاہیے کہ ابا کی راپسی پر ادا کریں گے۔“  
 ”خوب۔“ بھیا سونچ میں ڈوب گئے۔ ”میں نے کہا۔“

”بھیا آپ سے ایک چیز مانگ لوں۔“ ”ہاں بھئی مانگ لو۔“ وہ  
 ”وہ کونسی؟“ ”آپ ہم سے پاس رہ جی کیا گیا ہے؟“  
 ”آپ اس شادی سے انکار کر دیں۔“ میں نے ہشودہ دیا۔ ”تو رپو“

”بہتر :۔۔۔۔۔ بھینسا نے کہا۔  
 ”اے آپ نامہ کو بھی تسلی دیں ؟ میں نے کہا : میں اسے بھیجتی ہوں۔ اور  
 ان اسے نظر انداز نہ کر دیا کریں۔“

• یہی معافی چاہتا ہوں کہ اس دن میں نے . . . . ؟  
بھیا بات کرتے رہے۔ اہم چیزیں سے ان کے کمرے سے  
باہر نکل گئی۔

ناصر کو اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ میں نے اسے جگایا۔  
 کیا بات ہے رضیہ بہن؟ اس نے پوچھا۔  
 ”اسلم بھیجا تھا۔ انتظار کر رہے ہیں۔“ میں نے مسکرا کر کہا  
 ”میرا بامائیکہ؟“ اس نے تلخی سے کہا۔

آپ کا۔ میں نے جواب دیا ۷ میں نے سب معاملے کر  
کیا ہے۔ وہ مائتہ سے نفرت کرتے ہیں۔ میں اسماعیل سے بات چیت  
کر کے آئی ہوں۔

”مگر وہ تو ان کی ہونے والی جیسی ہے نہ نامہ نہ کچھ۔  
 نہ ہنسی۔“ میں نے جواب دیا: ”سبیا شاید ہی سے انکار کر دیں گے۔  
 اور میں اپنی زندگی میں ایسا نہ ہونے دوں گی۔“  
 سچ: وہ خوشی سے بول رہا تھا۔

”اے سچے۔ میں نے جواب دیا ”جاء مجھیا انتظار کر رہا ہے۔“  
اور سالہ اور اسی گھر پہ نہیں ہیں ؟

باجی تم بھی میری سیم خیال سے "بھیا سے ہونک کر کہا :"

”ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”بھیا نامہ کا نثر اچال سے  
وہ رورو کوہ بلکان سہوتی رہتی ہے۔ اس نے نہ جانے  
کیا کیا شیش محل بنائے تھے۔ مگر آپ کی بے اعتنائی اور  
سائنہ نے وہ سب محل چھینا چور کر دیئے۔ اس کی تو دنیا ہی  
اچھڑ گئی۔ وہ کسی سے بات بھی کیا کر سکتی ہے۔ وہ عورت ہے اپنی  
شاد کی کے بارے میں زبان نہیں کھول سکتی ہے۔ تم مرد ہو بھیتا  
تم امی اور ابدے صاف کہہ دو کہ میں نامہ دہ سے ہی شادی کروں  
گا۔ اور یاں میں بھی آپ کے ساتھ ہوں گھر کے دیگر افراد کو بھی  
میں ساتھ ملا لوں گی۔“

”شکر ہے۔“ جھپٹا نے کہا۔ ”تو نے اسی قدر مانگنا تھا۔“

”ہاں۔“ بیٹے نے جواب دیا۔

مرد تو میں دوسرے کرتا ہوں کہ میں اس مجاہد پر گھر سے نکل کر  
مولے لوں گا۔ اور ناصربہ کی فراموشی نہ کروں گا۔  
دو باجی میں دے اپنے ہاتھوں سے کسی اور کو نہیں سونپ سکتا۔  
ہنٹیک ہے۔ میں نے جواب دیا۔ ابھی خاموشی بہتر ہے۔  
سانہ کے ابا واپس آجائیں تو تم ہر روز راست ان سے بات کرو  
اور شادی سے انکار کرو۔ میں ناصربہ کی اور آپ کی شادی  
پر زور دوں گی؟

وہ تیزی سے اٹھ، اور یوں بھیا کے کمرے کی طرف بھاگی۔ جیسے وہ  
بچھڑے ہوئے شے والے ہوں۔۔۔ بھیا کے کمرے میں جا  
کر اس نے بھیا کے پاؤں کپڑے۔ بھیا گھبرا گئے اور بولے۔  
”ناصر! یہ کیا کر رہی ہو؟“

”ہی ان قدر سے دور ہونا نہیں چاہتی۔ ناصر نے جواب دیا۔  
”اور یقیناً کرے۔ مجھے علم ہی نہ تھا کہ حالات اتنے خراب ہو گئے ہیں  
یہ معاملہ کی کچھ فوج و جہد میرے ساتھ چھٹی رہتی ہے۔ تاؤ اسے کیا  
بھوں؟ اور ادھر تم ہو کہ تم شک کرنے لگتی ہو۔ اس لئے میں  
لے گئی ہوں۔ آنا کم کر دیا ہے۔ میں اپنا زیادہ وقت گھر سے باہر ہی  
گھمرا رہی ہوں۔“

”میں نے تو سنا ہے آپ کی اس سے منگنی کر دی گئی ہے۔“  
ناصر نے بالکل سی سے جواب دیا۔  
”کر دی گئی ہوگی؟ بھیا نے کہا۔ میں اس کی پردہ نہیں کرتا۔  
پورے شادی سے انکار کر دوں گا۔۔۔ ناصر میں نے ہمتیں  
اپنانے کا عہد کیا ہے۔ اور میں اپنا جان پرکھ سیل کر بھی اسے  
پورا کروں گا۔“

”نیچے آنا ہے چہ امید تھی۔“

ناصر نے جواب دیا۔

وہ کبھی کبھی دیر کے لئے ملاقات کا وقت نہ تو نکال لیا کرو۔“

بھیا نے کہا۔

”جی آپ خود وقت نہیں نکال لیتے۔ ناصر نے جواب دیا۔  
”ناصر ہی بھیا جذبات سے مغلوب ہو گئے۔ اور بولے۔

”میں کیا تباؤں۔ مجھے تم سے کتنا پیار ہے۔ ہر وقت ذہن پیست  
مسلط رہتی ہو۔ میں نے تمہارے لئے دنیا بھی جھپوڑنے کو تیار  
ہوں۔“

ناصر نے بھیا کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور بولی۔ ایسی بات  
نہ کہا کیجیے۔

بھیا مسکرا دیئے۔ ناصر نے جواب دیا۔

”رضیہ بہن کتنی اچھی ہے۔ کہ انہوں نے ہمارے لئے خود اہمی  
اور اب اسے جھگڑا مول لینے کا فیصلہ کیا ہے۔ ناصر بولی۔

”ہاں ناصر۔“ بھیا بولے۔۔۔ وہ میری بہن ہے۔ اور ہر  
بہن کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے بھائی کو اگر کچھ نہیں دے  
سکتی۔ تو غرضتیاں ضرور دے سکے۔ رضیہ کی بھی یہی نظری خواہش  
ہے۔ اور تم۔ وہ ہر کام کر گئے۔ گئی۔ مگر ہماری خوشیوں  
کو تباہ نہ ہونے دے گی۔ وہ بہن ہے۔ وہ بھائی کے لئے قربانی  
دے گی۔ مگر میں بھی خود فیصلہ کر لوں گا۔

وہ کتنی اچھی ہے۔ ناصر نے کہا۔

میں خوش ہو گئی۔ چلو اچھا ہوا اچھے سلوم ہو گیا۔ بھیا اور ناصر کے



کے دل میں میرے لئے کتنا احترام ہے۔ اتنے میں باہر سے آواز  
سنائی دی۔ اسی والپس آگئی تھیں۔ ناصرہ نے کہا۔  
”شاید اسی آگئی ہیں۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔“  
”خدا حافظ تہ بھیانے کہا۔“

ناصرہ نے اپنا سر پر ہاتھ بھیانے کے اہمق میں دے

دیا۔ اور بولی۔

”خدا حافظ۔“

بھیانے اہمق چوم لیا۔ اور شدت جذبات سے ناصرہ بھیانے  
کے سینے سے لگ گئی۔ مگر جلد وہ سنبھل گئی۔ اور اسی کے اندر آنے  
سے پہلے وہ اپنے کمرے میں بھاگ گئی۔

بھیانے کو نہ جانے کیا سوچی کہ انہوں نے سامئہ براہ راست اس مونیٹ  
پر گفتگو کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ وہ مناسب موقع کی تلاش میں رہے  
ایک روز انہوں نے موقع جان کر سامئہ سے کہا۔  
”سامئہ ایک بات کہوں؟“

”اں کہیے۔۔۔ سامئہ نے جواب دیا۔

”کیسی کا دل توڑنا کیا ہے؟“ بھیانے پوچھا۔

سامئہ خاموش خاموش سی بھیانے کے منہ کو دیکھنے لگی۔ اس کا خیال  
تھا کہ بھیانے اظہار محبت کرنے لگے ہیں۔ اس کے چہرے پر سرخی دوڑ

”میں نے پاں کہہ دیئے۔ سائلہ نے ضرر ماکر جواب دیا۔  
 ”مگر مجھے یہ شادی منظور نہیں سائلہ“ بیبا چلائے۔  
 ”میں پتھر کا کوئی بت تو نہیں ہوں کہ میرے بارے میں جو فیصلہ ہو  
 جائے میں اس پر رانے بھی نہ دوں۔“

سائلہ کا رنگ فق ہو گیا۔ پھر اس نے سوچا شاید بیبا  
 اسے آزمائے کے لئے ایسا کہہ رہے ہیں۔ اس نے اپنے حواس  
 پر قابو پا کر کہا۔  
 ”آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔؟“

”ہاں۔“ بیبا نے ہاتھ زور دے کر کہا۔ ”میں صحیح کہہ رہی  
 ہوں۔ اور تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں تم سے شادی نہیں  
 کر سکتا۔ میں نا مرد کو پسند کرتا ہوں۔ اس سے پیار کرتا ہوں  
 میں نے اس سے شادی کرنے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ اور ایسا  
 بھی ہو گا۔“

”مگر۔۔۔ مگر۔۔۔“ سائلہ نے کہا چایا۔  
 ”اگر مگر کیا“ بیبا نے کہا۔ ”میں نے بات کھول دی ہے  
 سائلہ سوچنے لگی۔ پھر بولی۔

”میں تمہاری خالہ زاد بہنوں۔ اور وعدہ کرتی ہوں کہ اپنے  
 آپ کو نہ تنہا سے زیادہ خوش رکھوں گی۔“  
 ”سائلہ۔“ بیبا نے زور دے کر کہا۔ ”یہ سب بات کا

گئی۔ وہ بولی  
 ”کسی کا دل توڑنا سب سے بڑا گناہ ہے۔“  
 ”تو کیا میں توقع کروں کہ تم میری ایک بات مانو گی؟“  
 بیبا نے پوچھا۔

سائلہ نے سوچا۔ اب وہ اظہار محبت شروع کر دیں گے۔ اور اس سے  
 پیار کا وعدہ لیں گے۔ چنانچہ اس نے ذرا خیر کہنے کی کھٹائی۔ اس نے کہا۔  
 اگر اسنے والی بات ہوئی تو مانیں گے۔ وعدہ نہیں۔  
 کیا کہا نہیں۔ بیبا نے چونک کر پوچھا  
 ”جی۔“ سائلہ نے کہا۔ ”آپ فرمائیے تو میں؟“  
 سائلہ تھیں معلوم ہو گیا ہو گا کہ گھر میں میری اور تمہاری لگائی کے تذکرے  
 ہو رہے ہیں۔ بیبا نے کہا۔  
 ”ہاں سنا تو ہے۔“ سائلہ نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔ اب تک غلط  
 نہیں کا شکار تھی۔

”اور یہ بھی پتہ ہے کہ یہ شادی ہماری رضا مندی کے خلاف  
 ہو رہی ہے۔“  
 بیبا نے کہا۔

”نہیں تو۔۔۔“ سائلہ نے جواب دیا۔ ”رضا مندی کے خلاف کیوں  
 ہونے لگی۔“ ابانے مجھ سے مشورہ کیا تھا۔  
 اور تم نے کیا جواب دیا تھا۔ بیبا نے اضطراب کے عالم میں پوچھا۔

مسئلہ ہے۔ اور میں تجزیات کو مروج کرنے کا حامی نہیں ہوں۔  
 مگر آپ کیا کریں گے؟ سائل نے کہا: "ہندوؤں نے جو فیصلہ کرنا  
 چاہا کریں۔"

”میں انکار کر دوں گا۔ اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو گھر چھوڑ دوں گا“  
بھیانے وضاحت کی۔

تم نے سوچا کہ اس طرح میری توہین ہوگی۔  
سائیک نے کہا۔

”ہوتی رہے۔ میں کیا کروں۔ تمہا نے جواب دیا  
 ”یہ بڑوں کا کام تھا کہ جیسے تمہا نے ابانے بات کرنے سے پہلے  
 تمہاری رضا مندی حاصل کر لی میرے ان باپ بھی میری رضا مندی  
 اور رائے حاصل کرتے۔ مگر انہوں نے شاید مجھے اس  
 قابل خیال نہ کیا کہ میں اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ  
 کیسکوں۔“

"میں ایک اور بات کرنا چاہتی ہوں" سائمنہ نے کہا۔  
 "مغصہ تو نہ کرو گے؟"

”بات کئے جاؤ۔“ بھیانک منہنی سے جواب دیا۔

”نامرہ کا چال چلن درست نہیں ہے اور وہ.....“

سما کہ نے کہنا چاہا۔

دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے دل سے غم و غصہ ہٹا دے اور ان کے دل میں سکون پیدا کر دے۔

ہو گئے تھے۔ مسلمانہ کو کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے کہا۔

”شکوہِ سلیم، آپ مجھ پر دے سکتے تھے۔ مگر میں  
 دعوہ کوئی ہوں کہ میری ثابت کردہوں گی کہ ناصر کا چال چلن خراب  
 ہے اور وہ چھپ چھپ کر نوجوانوں سے ملتا ہے۔“

بھیا کا خون کھول رہا تھا۔ اور دنیا بھیا نے غصے میں کانپ رہی تھی۔ سالہ نے خیرہ منوہ بھیا کو بلانے کے لئے یہ بات کی تھی۔ اور یہ بڑا ادھیچا بھیا رہتا تھا۔ میں جانتی تھی کہ مردوں کو کسی طور سے بارے میں متفر کرنے کے لئے یہ سب سے ادھیچا بھیا رہتا ہے۔ مگر میں نے خاموشی ہی میں عافیت خیال کی کیونکہ سالہ کے منہ پر بھیا نے پوری طاقت سے قبضہ مارا تھا۔ اور اگر یہ معاملہ مڑوں تک پہنچ جاتا تو نہ جانے کیا ہوتا۔ سالہ کچھ دیر تو بھیا کو دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھیں بھگی بھئی تھیں۔ اور ان میں آنسو تھے۔ بھیا نے غریب کے عالم میں تھے۔ پھر سالہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

اور اچھے کمرے کی طرف چلی گئی۔ اسی وقت  
کھانا وغیرہ تیار کر رہی تھیں۔۔۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور  
سائیکل کے پاس گئی تاکہ اس کا غصہ سرد کروں۔ آخر وہ میری خالہ  
زادہ بن گئی۔ اخیلا فانتا، اپنی جگہ۔ مگر اس کی دل شکنی تو نہ ہونا چاہیے

جواب دیا۔ تمہارے مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔  
میں غصے سے کانپ رہی تھی۔ میری تمام ہمدردی نفرت  
میں بدل گئی تھی۔ میں نے کہا۔

”کوئی بات نہیں یہ فیصلہ تو وقت کرے گا۔ کہ کون کیا  
کر سکتا ہے؟ اور حجت کس کی ہوتی ہے؟“

”میرا سر نہ کھاؤ۔“ وہ بولی۔ اپنے کام سے کام رکھو۔  
میں نے نفرت سے زمین پر دیا اور تیزی سے کمرے سے  
نکل گئی۔ ساتھ ساتھ یہ عروج پر تھا۔ بھیا کا پتھر کھا کر  
وہ ناصرہ سے انتقام لینے کی سوچ رہی تھی۔

میں خاموشی سے اپنے کمرے میں آکر بیٹھ گئی۔  
پھر میں نے ناصرہ کو بتانا ضروری خیال کیا۔ کہ بھیا نے اس کے  
لئے سائیکو پتھر مار دیا ہے۔ مگر ناصرہ نے اس کی کوئی خوشی نہ  
منائی۔ اس نے کہا۔

”رضیہ بہن یہ بہت بڑا ہوا۔ ساتھ مہمان تھی  
سلیم کو اس پر رنج نہ اٹھانا چاہیے تھا۔“  
”چھوڑو اس بات کو۔“

میں نے جواب دیا۔ جو سوا اٹھک ہوا۔  
موڈ بڑا خراب ہے۔ آؤ گھر کی ایک بازی لگالیں۔  
اور ہم اس واقعے کو فراموش کر کے کھینچ لگیں

وہ مجھے دیکھتے ہی چمکنے لگی۔ اچھا تو آپ آگئیں۔ جنوب ذرا نور سے  
میرے منہ پر پتھر نشان دیکھو۔ اور انگلیاں گنو۔ تم سوچتی  
ہو گی۔ میں اس کا ذکر امی سے کروں گی۔ یقین کرو ایسا نہ ہوگا۔ مجھے  
سلیم سے پیار ہے۔ وہ دو پتھر اور بھی مارتے تو میں پرواہ نہیں کروں گی  
مگر یہ پتھر ناصرہ کی وجہ سے مجھے کھانا پڑا ہے۔ اور میں اس کا  
حساب اسی سے لوں گی۔“

میری تمام ہمدردی نفرت میں بدل گئی۔ میں نے چلا کر کہا۔  
”ہوش کرو ساتھ تم سلیم کی بہن سے مخاطب ہو۔ میں ایسی قابل  
نفرت باتیں برداشت کرنے کی عادی نہیں ہوں۔“  
”ہو جاؤ گی؟ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

”تم ناصرہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔“ میں نے کہا۔ جس میں تمہارا خون پانی  
جاؤں گی۔“

”یہ بھی کر لینا۔ میں جانتی ہوں سلیم کو رغلانے تمہارا ہاتھ  
ہے۔ اس نے جواب دیا۔

”وہ میرا بھائی ہے۔ میں نے چلا کر جواب دیا۔“ میں ہو  
بمبارا سے کہوں گی وہ مان جلے گا۔“

”جاؤ اگر تم میں بھی کچھ ہمت ہے تو اسے اپنی بات  
منوا لو۔“

”میرے بس میں ہوگا تو ضرور منوا لوں گی۔ اس نے

چنانچہ انہوں نے سب کو انعام دیئے۔ اور اس خوشی میں سب کو اجازت دے دی کہ وہ اپنے دوستوں کو دعوت پر بلائیں۔ چنانچہ ہم سب نے ایک دعوت کا اہتمام کیا۔ جس میں سبھی ملے والوں کو بلا باگیا دعوت میں کوئی ناخوشگوار واقعہ نہ ہوا۔ بلکہ یہ دعوت بڑے دوستانہ ماحول میں انجام پذیر ہوئی۔ . . . . . سائیکل بھی خلاف مولیٰ اس میں پیش پیش تھی۔ وہ لوگوں سب سے گھل مل کر کام کر رہی تھی۔ جیسے اسے ہم سے کوئی عداوت یا شکایت نہ ہو اور میں حیران تھی کہ یہ انقلاب کیسے آگیا۔ میں نے سوچا شاید اسے احساس ہو گیا تھا۔ کہ بھیا اس کے ہاتھ آنے سے رہے پھر کیوں خالہ زاد بہن سے اور ایک معصوم اور یتیم بچی سے دشمنی مولیٰ جائے؟

میں نے سائیکل کی تعمیر کی۔ بھیا نے محسوس کیا کہ اب بھیا اور نامہرہ کا معاملہ زیادہ آسانی سے سلجھ جائے گا۔ میں دادر کے دانا میں شرکت سے مستعین رہا۔ اور ہر اچھا دار کرنے کو تیار بیٹھی رہی۔

چھر کاٹ کھل گئے۔ اور ہم نے کانچ میں داخل ہو گئے۔ طب کی اعلیٰ تعلیم کے لئے۔ اب تو نامہرہ سفید کوٹ میں زیادہ حین معلوم ہوتی تھی۔ میں بھی میڈیکل میں پڑھنے لگی۔ بھیا نے بھی اسی گروپ میں داخلہ لے لیا۔ اب تو ہماری مصروفیات دو چہند



امتحان کے نتائج میں ہم سب نے شاندار کامیابی حاصل کی مگر اس بار معاملہ کچھ برعکس رہا۔ سب سے زیادہ نمبر بھیا نے حاصل کئے۔ نامہرہ دوسرے نمبر پر تھی۔ اس نے بھیا سے صرف دس نمبر کم لئے تھے اور وہ اسی میں خوش تھی کہ بھیا کم از کم اس کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا پڑا۔ چنانچہ اس نے بھیا کو احساس دلادیا کہ وہ اس سے برتر ہیں میں تیسرے نمبر پر تھی۔ میں نے نامہرہ سے اٹھائیس نمبر کم لئے تھے۔ یہ تو بے شدہ بات تھی کہ ہمارے بھائی جان تو ایسے موقعوں پر کھڑے ہیں بھائیوں کی حوصلہ افزائی کے عادی تھے وہ ہمیں انعام ضرور دیتے تھے

ہو گئیں۔ اور ہم سب خود کو زیادہ ذمہ دار محسوس کرنے لگے۔  
مگر دالے ہم پر زیادہ توجہ صرف کرنے لگے۔

مگر سائنسہ متعام لینے کے بہانے تلاش کرتی رہی۔

اور ایک روز تو اس نے بڑی اچھی چال چلی۔ اس نے بھائی  
جان کا سگریٹ سناگیا اور اسے نامرہ کے بستر میں رکھ دیا۔

بستر میں کچھ دیر بعد آگ لگ گئی۔ ارد گرد جلنے  
والی۔ با آگ پکڑنے والی کوئی چیز نہ تھی۔ اس لئے صرف  
بستر جل کر خاک ہو گیا۔

شام کو جب نامرہ کانچ سے لوٹی تو اس نے کمرے  
کا یہ تاثر دیکھا کچھ بھی اس کی سمجھ میں نہ آ سکا۔

بھیا ابھی کانچ سے نہ لوٹے تھے۔ نامرہ ڈر گئی  
اس سے اتنا بڑا نقصان ہو گیا تھا۔ وہ رونے لگی۔ اور بھائی  
جان کو بتا دیا کہ اس کے کمرے میں آگ لگ گئی ہے۔ اور اب  
جب وہ لوٹی ہے تو بستر جلا ہوا ہے۔ پل بھر میں کسی نے  
خبرامی کو بھی دے دی۔ اب بھی گھر آگے رکتے۔ اتنے میں بھیا بھی آ  
گئے۔

سب مل کر نامرہ کے کمرے میں گئے۔ اچانک امی چلائی  
”اولی اللہ سگریٹ“  
”سگریٹ“۔ ابا نے کہا۔ یہاں سگریٹ کا کیا کام؟

”یہ دیکھو۔“ اور امی نے سگریٹ کے جلنے ہوئے چند ٹکڑے  
”تلاش کو کے ابا کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔“

در اصل یہ ٹکڑے سائنسہ نے پھینکے تھے۔

سائنسہ بھی امی کے ساتھ ان کے پیچھے کھڑی تھی۔ اور اس کے  
سامنے میں کھڑی تھی۔۔۔۔۔ ابا نے کہا۔

”تو اس کا مطلب یہ ہو کہ یہ آگ۔ سگریٹ پیسنے سے  
لگی ہے۔“

”جی ہاں۔ امی نے مختصر جواب دیا۔ وہ شاید فیصلہ ابا کی  
زبان سے کر دانا چاہتی تھی۔“

”نامرہ بیٹی یہ سگریٹ کس نے پیئے ہیں؟ ابا نے پوچھا۔  
نامرہ خاموشی سے یہ سب کچھ دیکھتی رہی۔ پھر اس نے کہا۔  
”مجھے کوئی علم نہیں یہ سب میری غیر موجودگی میں ہوا ہے۔“  
”کیا سلیم سگریٹ پیتا ہے؟“

ابا نے بھائی جان سے پوچھا۔

”نہیں۔“ بھائی جان نے جواب دیا۔ اس کے بارے میں  
میں قسم کھا سکتا ہوں۔“

”تو یہ سگریٹ نامرہ نے پیئے ہیں؟“

امی نے چلا کر کہا۔

”بتاؤ بیٹی نامرہ تنہا رہے کمرے میں کون آیا تھا۔ جس نے

تمہارے بستر پر لیٹ کر سگریٹ پیئے ۔ اور پھر باجری میں بستر  
جلادیا ؟

ابانے کا ۔ باقی سب خاموش تھے ۔ اور بھلا ابا کے سامنے  
کون بولنے کی جرأت کر سکتا تھا ۔

نامرہ نے کہا ۔

”میں قسم کھاتی ہوں کہ مجھے علم نہیں ہے“

”یہ کیا بنا رہی“ اسی پتلا میں ۔ اس نے تو گھر کو حرام کاری کا  
اڈا سمجھ رکھا ہے ۔ اور میرے بچوں کو تراب کر رہی ہے ۔“

پھر انہوں نے نامرہ کو باؤں سے پکڑ لیا ۔ اور بولی  
”ہاں کون کیا تھرات تیرے پاس ہے“

”یہ کیا کر رہا میں آپ ہے“

بھائی جان اسے چھڑانے کو بڑھتے ۔

”تم پرے ہٹو“ اسی نے انہیں دھکا دیا ۔ گھر میں میری  
جوان بچیاں ہیں ۔ میں یہ حرکات برداشت نہیں کر سکتی ۔  
نامرہ رونے لگی ۔

وہ واقعی بے قصور تھی ۔

بھانے کہا ۔

”تم بتاتی کیوں نہیں ہو نامرہ ؟“

نامرہ کیا بتاتی ۔ اس نے کہا ۔

”میں کچھ بھی تو نہیں جانتی ؟“

بھیا کے چہرے پر بے چینی کے نشان تھے ۔

ابا کی مداخلت پر امی نے اسے چھوڑ دیا ۔ اور ابا نے  
کہا ۔

”نامرہ حالات اتنا کو پہنچ چکے ہیں ۔ تم میرے دوست

کی بیٹی ہو ۔ میں نے ہمیشہ تمہیں اپنی بیٹی خیال کیا ہے ۔

میں تمہاری منت کرتا ہوں کہ میرا مرنہ حرام نہ کرو اور ....

”میں بے گناہ ہوں ۔ خدا کی قسم مجھے معلوم نہیں ہے“

نامرہ رو رو کر چیلائی ۔

”ہیٹر ٹیل اب ٹسو لے بہاتی ہے ۔ یار سے تو خوب

عیش و عشرت کی جوگی ہے“

امی نے اسے چوٹی سے پکڑ لیا ۔ بھیا نے نامرہ

کو چھڑانے کی کوشش بھی نہ کی ۔ بھائی جان اور ابا کی مداخلت پر  
نامرہ کو چھوڑ دیا گیا ۔

امی نے اعلان کر دیا کہ اب نامرہ اس گھر میں نہ رہے

گاہ بدکار ہے ۔ اور ہمیں منع کر دیا گیا کہ نامرہ سے میل ملاقات

نہ رکھیں ۔ چنانچہ نامرہ بے چاری اکیلی رہ گئی ۔ گھر سے تو فرار سے

نہ نکالا جاسکا ۔ البتہ ہمارا اس سے زیادہ میل ملاپ ختم

ہو گیا ۔ سارا نامرہ کی اس بے عزتی سے بہت خوش تھی ۔

اور بھیا بھی نامرہ سے بے حد ناراض اور بدظن تھے۔  
وہ اب کھلم کھلا سائٹھ میں دھپسی لینے لگے تھے۔

بھمرہ بے چاری کے پاس آنسوؤں کے سوا اس کا علاج بھی  
نہیں تھا۔ وہ دن رات روتی رہتی۔ آخر میں نے نامرہ سے مل  
کر بات کی۔ میں نے کہا۔

”نامرہ میرا جانتی ہوں کہ تم بے گناہ ہو۔ سائٹھ نے تم سے  
انصاف لے لیا ہے۔ وہ بہت بدذات لوگ ہیں۔ تم کیوں  
میں اس کا نام لے رہی ہو؟“

”میں نے معاملہ بڑا بدچھوڑ دیا ہے۔ نامرہ نے جواب دیا  
”وہ انصاف کرنے لگا۔ اور جس کا قصور ہوگا۔ اسے ضرور  
سزا ملے گی۔“

”ہیں“ میں نے جواب دیا ”خدا بھی اس کا ساتھ دیتا ہے  
جو اپنا ملو آپ کرتے ہیں۔ تمہیں ظلم کے خلاف آواز بلند کرنی  
ہوگی۔“

”جو آپریکھ تھا وہی ساتھ چھوڑ گئے۔“ نامرہ نے  
جواب دیا۔ ”میں نے زندگی میں پہلی بار ایسا محسوس کیا  
ہے۔“

میں سمجھ گئی کہ نامرہ بھیا کے بارے میں کہہ رہی ہے۔  
میں نے کہا۔

”بھمرہ کو نامرہ۔ بھیا بھی بے گناہ ہیں۔ انہیں ایسا ہی کرنا  
چاہیئے تھا۔ وہ تم سے نہیں جانتے تو اس میں تمہارا قصور  
ہے۔ کہ تم نے کیوں اپنی پوزیشن واضح نہیں کر دی؟  
یقین کرو وہ تمہیں ضرور تسلی دیتے۔ خیر اب بھی کیا گیا ہے  
میں خود بھیا سے بات کروں گی۔“

”بھائی جان بھی تو نہیں بات کرتے۔“  
نامرہ رونے لگی۔

”میں سب درست کروں گی۔ میں نے جواب دیا۔

اور بھیا کے کمرے کی طرف چلی دی۔ جب میں نے بھیا کو بتایا کہ  
نامرہ بے گناہ ہے۔ اور اس ساری جالاک میں سراسر سائٹھ  
کا ہاتھ ہے۔ تو پیچھے وہ ہن نہ سکے۔ ”مگر بھرات ان کا  
سمجھ میں آگئی۔ انہوں نے کہا۔“ بیٹیک پہ میں سارے  
مسلے کی تحقیقات کروں گا۔“

ان کا غصہ جانا رہا تھا۔ اور وہ کچھ سوچ رہے تھے۔  
پھر میں بھائی کے پاس گئی۔ بھائی جان بھی ان کے ساتھ  
بیٹھے تھے۔ یہ کھیل رہے تھے۔ میں نے منان سے پھین لیا۔  
اور اسے پیار کرنے لگی۔ بھائی اور بھیا مسکرانے لگے۔  
منا نے کہا۔

”ایک بہن تھی۔ وہ بھی پھین لی آپ نے۔“



”اس کا نام نہ لو“ بھائی جان غصے میں چلائے۔ ”میں نے اس سے جتنا پیار کیا اس کا انجام دیکھ لیا۔ اس نے ہمیں ذلیل کر دیا۔“

”بھائی جان“ میں نے کہا۔ ”ذرا خیال کرو۔“

ہمارے گھر کا ماحول اس قسم کا ہے کہ کوئی بھی شخص چوری چھپے نافرہ کے کمرے میں نہیں جاسکتا۔ اور پھر نافرہ کے ساتھ سارا دن میں رہتی ہوں۔

اسے ایسی حرکات کا کون سا موقع ملتا ہوگا۔ میں یقین دلاتی ہوں کہ وہ بالکل بے گناہ ہے۔ اور آپسکے کی طرح محسوم ہے۔  
”تو وہ خود سگریٹ پیئے لگی ہے؟“  
بھائی جان نے سوال کیا۔

”میں نے بھائی جان کو عیسا کی شکلی۔ سائیکہ کی صداوت۔۔۔ گڈنٹھ لڑائیاں۔۔۔ اور جلد۔ سب بتا دیا۔ بھائی جان غور سے سنتے رہے۔ بھائی بولیں۔“

”یہ درست ہے اس روز میں نے بھی سائیکہ کو نافرہ کے کمرے میں جاتے دیکھا تھا۔“

”ہاں۔ بھائی جان نے جواب دیا۔۔۔ میں سوچتا ہوں کہ کوئی شخص اس کے کمرے میں نہیں جاسکتا اور نہ اتنی جرات سے سگریٹ پی سکتا ہے۔“

”تو بھائی جان نافرہ کو کس گناہ کی سزا ملی ہے۔“  
”ہم اسے سنا نہیں گئے۔“ بھائی جان نے جواب دیا۔

اور میں خوش خوش نافرہ کے کمرے میں آگئی۔

نافرہ خوش بیٹھی تھی۔ جیسا ابھی ابھی کمرے سے باہر نکلتے تھے۔ میں جان گئی کہ ضرور بھیانک نافرہ سے معافی مانگی ہے۔ بھائی جان نے نافرہ کو پیار کیا۔ اور اس سے معافی مانگی۔ نافرہ نے صرف اس قدر کہا۔

”بھائی جان میں بے گناہ ہوں۔۔۔ خدا میرا انصاف کرے گا۔“

بھائی جان نے نافرہ کو ایک عمدہ سائیکس لاکر دینے کا وعدہ کیا۔ اور یوں نافرہ کو ذرا حوصلہ ہوا اور نہ وہ تو خود کشی کا ارادہ کر چکی تھی۔

بہترین چیزیں



”زیادہ بکواس کی ضرورت نہیں۔ بھیا پلائے۔ یہ گھر ہے خواتین کا کوٹھہ نہیں۔ آج ابا کو آئیے دو میں سب معاملے کر لوں گا۔“

اب یہ سب زیادہ دیر نہیں چل سکتا۔ مجھے تو اسی روز شک ہو گیا تھا۔ غافلہ بن رہی تھی۔ ابھی اسی نے پیٹے ہوئے گٹے سارے لقمہ دیا میں اپنے کمرے میں تھی۔ میں جلدی سے باہر نکلی۔ یہ کیا شو تھو۔ میں نے دیکھا۔ نامرہ نہ پر عتاب تھی۔

اتنے میں ابا بھی آگئے۔ گھر کے حالات دیکھ کر انہوں نے کہا۔

”کیا معاملہ ہے؟“ آپ لوگ اس طرح کیوں کھڑے ہیں؟“

”اپنی لادلی سے پوچھ لیجئے۔“ امی نے تیزی سے کہا۔

”بھئی بناؤ دیکھا ہوا؟“ ابا نامرہ سے مخاطب ہو گئے۔

”مخالو جان یہ کیا بتائے گی۔ سارے نے جواب دیا۔

”اس روز اس نے رمینہ بہن سے کہا تھا۔ کہ اس کے کمرے میں میں نے شرارت سے سگریٹ رکھ دیئے ہیں۔ اور آج اس کا بھید کھل گیا۔ سب نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ نامرہ سچی تھی یا جھوٹی۔“

”ہو کیا آخر؟“ ابا نے پھر پوچھا۔

”وہ فوجان یہاں آیا تھا۔ امی نے بتایا۔

”کون فوجان؟“ ابا چاکر ہوئے۔

”وہی نامرہ کا دوست۔“ امی نے جواب دیا۔

”کچل کر بات کرو۔“ ابا نے نامی سے پوچھا۔

”امی نے غلطی بات بتادی۔ اور اعلان کر دیا کہ اس گھر میں

پانچویں رہیں یا نامرہ۔“ ابا نے پوچھا۔ ”کون تیار نامرہ؟“

نامرہ نے ساری بات بتادی اور ابا سے کہا۔ کہ خدا

کے لئے وہ بات کی تصدیق کریں کہ میں سچی ہوں یا جھوٹی کا بیج سے

سب پتہ چل سکتا ہے۔ یہ لوگ خواہ مخواہ مجھے بدنام کر رہے

ہیں۔“

نامرہ کے رونے سے ابا ذرا مایوس ہوئے انہوں

نے کہا۔

”اچھا اب جاؤ میں تصدیق کروں گا۔“

”مگر آپ کو یہ فیصلہ کرنا ہو گا۔ امی پہلا میں۔“

”کیسا فیصلہ؟“ ابا نے پوچھا۔ ان کا موڈ انتہائی

خراب تھا۔

”کہ نامرہ اس گھر میں نہیں رہے گی۔ اس کی بیس قدر

جلد ہو کے شادی کر دو۔“

”ہاں ایسا کرنا ہی ہو گا۔“ ابا نے زہیمے لہجے میں جواب

دیا۔ اور اندر چلے گئے۔ نامرہ روتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی

بھیا کا موڈ بھی بے حد خراب تھا۔ یہاں دکھائی دیتا تھا

کہ اگر یہاں ابا اور امی موجود نہ ہوتے تو نامرہ کو خوب ملے رہتے

اور اس کی پٹائی کرتے۔ ہوں نے ناعمرہ کے کمرے میں جا کر اسے تسلی دینا چاہی۔ مگر مجھے اسی کی آواز سنائی دی۔  
”رضیہ“

”جی نہیں نے مڑ کر پوچھا۔

”اس کے پاس جانے یا اس سے بات کرنے کی ضرورت نہیں“ اسی نے حکم صادر کر دیا۔

”اور میں اپنے کمرے میں چلی گئی۔ شام کو بھائی جان آئے۔ بھائی نے اس معاملے میں کوئی مداخلت نہ کی تھی۔ اس نے سب معاملہ بھائی جان کو بتا دیا۔ بھائی جان نے کہا۔  
”میں ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ ناعمرہ نے ایسا کیا ہو گا۔  
عزیز وہ ناعمرہ کی سبیلی کا بھائی ہو گا۔“

”ہاں میرا بھی یہی خیال ہے“ بھائی نے

جواب دیا۔

”لوگیا پروگرام ہے اس کی تصدیق کی جائے“  
بھائی جان نے پوچھا۔

”ہاں“ بھائی نے جواب دیا۔ ”رضیہ سے آپ کیسے

کہ وہ کل کاغذ سے اس کی تصدیق کر کے آئے۔ اور اصل حالات سے نہیں آگاہ کرنے تاکہ بے چاری ناعمرہ پر بے جا ظلم نہ ہو۔“  
”بھائی جان نے کہا۔ پھر انہوں نے ناعمرہ کو

اور مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور کہا۔

”دیکھو ناعمرہ غلط فہمی تو انسان کو ہو جاتی ہے اس کا حل یہ نہیں کہ تم رور و کر خود کو ہلکان کر لو۔ یقین کرو اگر تم سچائی کہہ دو تو میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

”میں قسم کھاتی ہوں کہ آپ سب نے غلط سمجھا ہے میں سچی ہوں اور میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔“

”ٹھیک ہے“ بھیانے جواب دیا۔ ”میں اس کی تصدیق کر لوں گا پھر بعد میں مجھے غلطی کے کہا۔“

”جو“

”جی میں نے جواب دیا۔

”تم اس گھر کی عزت ہو اس گھر کی عزت کے ناموس کی حفاظت تمہارا فرض ہے۔ تم کلی اس بات کی تصدیق کرو کہ ناعمرہ سچی کہتی ہے یا غلط“ بھیانے کہا۔

”جی میں ضرور تصدیق کروں گی“ میں نے جواب دیا۔

پھر ہم اپنے کمرے میں آگئیں۔ اور ناعمرہ سے ملنے کا بارانہ تلاش کرنے لگی۔ رات گئے میں ناعمرہ کے کمرے میں گئی وہ رور و کر بے حال ہو رہی تھی۔ اور گھٹنوں میں سر دیئے ابھی تک بیٹھی تھی۔ میں نے کہا۔

”ناعمرہ میں تمہاری بہن ہوں۔ یقین کرو میں تمہیں بے گناہ





میں نے کہا جیسا تھا اب میں بچوں کو بگنی کر رہی  
چلیے۔ میرے دل میں بھی ارمان ہے۔ اور آپا کی مرضی بعد  
آئے ہیں۔ جانے سے پہلے یہ رسم ادا ہو جانا چاہیے۔  
نیشک ہے۔ سامان کے ابا نے کہا۔ مجھے کوئی  
اعتراف نہیں۔

اور پھر امی نے ان کی کسی کو بلو چنے مگنی کے کارڈ پچنے کو دے  
دیئے۔ اگلے روز سامان کے ابا کارڈ چھپوا لائے۔ ناصرہ بھیا  
اور میں بے حد مصروف تھی۔ تھامت پندرہ امی نے یہ بھی نہ سوچا  
کہ بھیا سے پوچھ ہی لیا جائے۔ ان کے خیال میں مہیا کو اس میں  
کوئی اعتراض نہ ہو سکتا تھا۔ امی نے اور امی نے کانٹہ کچے اور  
پلاسٹک کر دیئے۔ عجیب اتفاق تھا کہ بانی جان کو بھی منورہ کے  
لے کر کہا گیا۔ اسی شام امی نے بھیا کی بلاتیں  
نے کر کہا۔

”بیٹے ابا سامان سے نہ زیادہ بات نہ کیا کرو۔“ کیوں امی  
وہ میری بہن ہے۔

بھیا نے جواب دیا۔

”نہی تھا۔ وہ تمہاری بہن ہے۔ والی بیڑی ہے۔“

امی نے جواب دیا۔

”ابا ایسا نہ سوچا کرو۔“

عجیب بات تھی کہ بھیا ایک وقت میں دو شادیاں کرنا چاہتے تھے  
اگر ایسا نہ تھا تو پھر بھیا کا کیا پروگرام تھا۔ وہ کیوں  
ایک طرف رہ کر کوئی بات نہ کرتے تھے۔ میں اسی الجھن کا شکار تھی  
کہ ایک دن جب میں ہسپتال سے گھر لوٹی تو ایک عجیب ہنگامہ سا  
برپا تھا۔ سامان بے حد خوش تھی۔ میں نے پوچھا۔

”کیا بات ہے گھر باری کی صفائی ہو رہی ہے؟“

”ہاں“ سامان نے جواب دیا۔ ”میرے کے بعد آبا آ رہے ہیں

آج ہی شام کو۔“

ہم نے سب پروگرام منسوخ کر دیئے اور سامان کے ابا کے  
استقبال کا تیار کر کے لگے۔ آخر یہ بھی تو ضروری تھا اسی شام  
سامان کے ابا کو ہم لوگ ہوائی اڈے سے لے کر آ رہے تھے  
سامان کے ابا کے اعزاز میں خوب خوب دعوت دی گئی۔

سامان بے حد خوش تھی۔ اور میں بے حد غلگلیں سامان کے ابا کے آ  
جانے سے میں سوچنے لگی۔ کہ اب فیصلہ کن لمحات آن پہنچے ہیں  
بھیا بھی ہسپتال میں ملازم ہیں۔ اور اب امی جلد ان کی شادی کر دینا  
چاہتی ہیں۔ امی کا خیال تھا کہ جوان بیٹوں کا زیادہ دیر کنوارا رکھنا  
نیشک نہیں ہوتا۔ اور پھر بھیا تو خود ڈاکٹر تھے جو خواتین میں گھرے رہتے  
تھے۔ امی کو خطرہ تھا کہ جو اب ایک نہ جائے اور لڑکا ہاتھ سے نہ نکل جائے  
دوسرے روز ہماری غیر موجودگی میں امی نے سامان کے ابا سے کہا۔

گھر کیوں؟

بھیا نے پوچھا۔

”تہاری اس سے ملگنی ہو گئی ہے۔ امی نے بتایا۔

”جی ہاں۔۔۔ بھیا چونک پڑے۔

”ہاں۔ اور پر سوں تو اسی ملگنی ہے۔ رشتہ داروں کو کارڈ

بھیج دینے گئے ہیں۔ تم دو چار چٹھیاں لے لو۔

امی نے بتایا۔

”امی۔ بھیا چلائے۔ ایسا کیوں کیا آپ نے؟

”کیا غلط ہے؟۔۔۔ امی مسکرا دیں۔

”ہاں۔۔۔ بھیا نے جواب دیا۔ میں سائلہ سے

شادی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں ناھرہ سے شادی کروں گا!

میں نے بھی سب باتیں اپنے کانوں سے سنیں۔ پیسے تو

مجھے یقین نہ آیا اور پھر حالات پر ردنا آگیا۔ کہ تقدیر نے ہم سب سے

کتنا زبردست عداوت کیا ہے۔۔۔ میں رونے لگی۔

امی کہہ رہی تھیں۔

”سیلم بیٹا ہوش نہ کرنا۔ میں نے سب کچھ کر لیا

ہے۔ کارڈنگ پمپ چکے ہیں۔ تاریخ مقرر ہو چکی ہے۔ اب کیا

ہو سکتا ہے۔ عقل مندی سے کام لو۔ اور جو کچھ ہوتا ہے ہونے دو۔

ساکر اس وقت اپنے ابا کے ساتھ بازار گئی ہوئی تھی۔

وہ کچھ خریداری کے موڈ میں تھے۔ اور خریداری کے سلسلے میں گئے

تھے۔ ورنہ ایک اور طوفان اٹھتا۔۔۔ سلیم بھیا چلائے

”امی۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں خود کٹی کر لوں گا۔“

”ایسا ہی ہو گا۔ تمہیں ایسا کرنا پڑے گا۔“

امی نے غصے سے کہا۔

”تو میں گھر سے جا رہا ہوں۔ بھیا دروازے کا طرف

پلکے سے جس گھر میں میری حیثیت، ایک حیدر خان سے کم نہیں اس

میں رہنا بذات خود غلط ہے۔“

امی کے قہقہوں میں اور انہیں زندگی میں پہلی بار

دل کا زبردست دورا پڑا۔ ناھرہ نے بھی سب کچھ سن لیا تھا۔

ہم سب امی کو پکڑنے لپکے۔ بھیا بھی واپس لوٹ آئے۔ وہ

دروازے سے باہر دھکی نہ گئے تھے۔ ماں کی نسبت، بھیا کی مندر پر

غالب انگلی۔ بھیا نے اسی کو بازوؤں میں قہقہہ لیا۔ اور چار پائی پر

لٹایا۔ گھر میں تین ڈاکڑوں کی سبو دگی میں اور کیا چاہئے تھا۔ امی کو

دن کا جان لیوا دورہ پڑا۔ ابا اور بھیا کی جان کو فون کر کے بلایا گیا۔ اور

امی کی دیکھ بھال کی جانے لگی۔

ابا کے آنے تک، امی کو نیم مردہ ہو چکی تھیں۔ ابا نے امی کی

نبض دیکھی۔ انہوں نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں اور کہا۔

”سلیم نے اچھا پیڑ لگایا۔“



ماصہ چٹائی۔

”سلیم۔ اسی سے کہہ دو تو نہیں ان کی بات منظر پر ہے۔“

در نہ تم جانتے ہو ان کی زندگی فطرے میں ہے۔

بھیا امی کی زندگی کا سن کر کانپ گئے۔ وہ بے اختیار

می سے ابھری گئے اور پورے ۔

”امی بہوش کنبر۔۔۔ میں آپ کے اشارے پر چلنا سہاوت

منہری انہیں کروں گا۔ آنکھیں کھولو امی۔

دور ای مسکریا دیں۔ . . . . دقت مرے دل

نیکو امی نہیں ہو گی۔۔۔ گریہ اُمی کو تو دل سے چھکے تھے

————— میں نے ناصرہ کے کمرے کے اہر سے گزرتے ہوئے انہیں

جہاں گزریں وہاں رہیں۔۔۔ قسمت نے کتنے

درد تک طریقے سے ہمارا فراق اڑا دیتا ہے۔

تبرکات



تیسرے دن گھر کو بھیجی کی مگنی کی تقریب کے لئے سجاایا

گیا۔ سائل کے بے حد غم و غم و غم۔ اسی نے بازاری جہیت کی تھی۔ مجھے

بارہ خیال آیا کہ نہ پر بھر ایک ٹھیکہ سالانہ کو لگا کر اسی کی زندگی کا خاتمہ

کردوں۔ اور ایکسٹیک خود اگلے لوں۔ گمرین نامکن تھا۔ اس میں

میں خاندان کی بدنامی کا مسئلہ تھا۔ پھر میں کیا کر سکتی تھی؟ میں نے

فیصلہ کیا کہ بھائی جان سے کہہ کر حالات پر غماخ پانے کی کوشش کی

جائے چنانچہ میں نے بھائی کجان سے ایک مناسب موقع پر کہا۔

”بھائی جہان جیسا کہ منگنی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟“

”میں نہیں بکھا رخصتہ۔“ بھائی بھان نے محبت سے کہا۔ ”تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ منگنی تو بھر پور ہو سونا ہو گی۔“ آپ کو تو علم ہے بھیا اس شادی کے خلاف ہیں۔ وہ نامرہ سے پیار کرتے ہیں۔ ان کا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ ان کا خوشیاں ختم ہو جائیں گی۔ بھائی بھان یہ بھیا اور نامرہ پر ظلم ہے۔ میں اپنے بھائی پر ظلم برداشت نہیں کر سکتی۔ خدا کے لئے اس اقرب کو روکئے۔“

”بھین رخصتہ بھائی بھان نے سرد آہ بھر کر کہا۔ یہ اقرب مفرد ہو گی۔ ورنہ ہم ماں سے محروم ہو جائیں گے۔ اور اس معاملے میں میں کچھ بھی نہ ٹوٹوں گا۔ مگر تمہیں معلوم ہونا چاہیے مجھے اس شادی پر سب سے زیادہ افسوس ہے۔ سلیم اور تم سے بھی زیادہ۔ کیونکہ میں اپنی معصوم نامرہ کو خوشیاں نہ دے سکا۔“

میں خاموش ہو گئی۔ بھیا واقعی مجبور تھے۔ اور یہ شادی روکنا یا کوئی اور کارروائی کرنا ان کے بس میں نہ تھا۔ پھر میں بھیا سے ملی۔ وہ بیوی کرے میں گم سم بیٹھے تھے۔ جیسے صبح انہیں خدا نہ کرے بھائی کی سزا مل جائے گی۔ میں ان سے کوئی بات نہ کر سکی۔ وہ میری طرف دیکھتے رہے۔ پھر وہ ہچٹ ہڑے ہیں سے زیادہ وہ اپنا دکھ اور کس سے بانٹ سکتے تھے۔ جبکہ دکھ دینے والی خود مارتی۔ میں نے زندگی میں پہلی بار بھیا کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ میں دیکھتی رہی۔ وہ بولے۔

”رجو بہنا تم یہ کہنے آئی ہو کہ تمہیں یہ کیا حق حاصل تھا کہ تم ایک معصوم کا دل توڑ دو۔ تم نے نامرہ سے جھوٹے وعدے کئے تھے۔ تم نے اس کی وفا کی لاج نہ رکھی۔ تم نے یہ کیا کیا۔“ مگر رخصتہ باجی۔ میں اس قدر مجبور ہو گیا ہوں غیبت و کینہ نہیں جانتی ہو۔ میں ماں کو ہمو کر بیوی حاصل کرنے کا سوچا نہیں کر سکتا۔ اور ماں نے اسے اپنی عزت اور زندگی کا مسئلہ بنا لیا ہے۔ میں ان کے لئے قربانی دینا چاہتا تھا۔ اور اگر تم مجھے یہ طعنہ دینے والی ہو۔ کہ تم نے اچھا نہیں کیا تو میں خود کئی کر لوں گا۔ میں زندہ رہنا نہیں چاہتا۔ رخصتہ بہن مجھ سے نامرہ چھین گئی۔ تو میں تلاش ہو جاؤں گا۔ میرے دل میں اس کے سوا اور کوئی چیز جگہ نہیں پاسکتی ان بھیا کو کتنا احمق ہے۔ وہ تو مرنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ میں بے قابو ہو گئی۔ میں اپنے بھائی کو پریشان نہ ہونے دوں گی۔ میں نے فیصلہ کر لیا۔ پھر میں نے بھیا کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں بھیا سے پٹ گئی۔ اور بے اختیار بولی۔

”بھیا خدا کے لئے ہمارا انتقام نہ لو۔ میں آپ کو قہر کی بیانی نہیں دیکھ سکتی۔“

بھیا کا میں دل غبر آیا۔ وہ بھرائی آواز میں بولے۔

”تو بہاؤ نہ جو باجی میں اب کیا کر دوں؟“

میں نے ایک ترکیب سوچی ہے۔

نیر نے جواب دیا۔

”کیا ترکیب ہے؟“

”پوچھا۔“

”یہاں آپ نامہ کو بلا لیں۔ میں اپنی ترکیب آپ دونوں کو سنادوں گی۔“

چنانچہ میں نامہ کو بھونک کر لے میں بلا لائی۔ اسی اس وقت ابا کے ساتھ بازار گئی تھیں۔ ساتھ بھی موجود نہ تھی۔

میں نے کہا۔ ”اگر میں یہ کہوں کہ آپ کے مہاپ

کی صورت ایک چالاک سے جس سے آپ گھر والوں کو بے

و خوف بنا کر ایک سو لکے ہیں۔ تو آپ مان لیں گے۔“

”ہاں ہاں۔ موزور مانیں گے۔“

”یہاں نے کہا“

”جی“ نامہ نے سرور سے آواز میں جواب دیا۔

”تو سنو“ میں نے کہا۔ ”آپ اطمینان سے سگنی

ہونے دیں۔“

”یہاں چلا کے“ آپ مذاق کر رہی ہیں۔ یا اسی سے

مل گئی ہیں۔“

”نہیں۔“

”اچھا بتاؤ،“

”اچھا بتاؤ،“

”اچھا بتاؤ،“

”اچھا بتاؤ،“

”اچھا بتاؤ،“

”اچھا بتاؤ،“

”اچھا بتاؤ،“

”اچھا بتاؤ،“

”اچھا بتاؤ،“

”اچھا بتاؤ،“

”اچھا بتاؤ،“

”اچھا بتاؤ،“

”اچھا بتاؤ،“

”اچھا بتاؤ،“

”اچھا بتاؤ،“

”اچھا بتاؤ،“

”اچھا بتاؤ،“



بولی تہ تمہیں بھی مبارک ہو۔  
 اور اپنے گلے سے گلاب کے پھولوں کا بڑا سنا ہوا تار  
 کرنامرہ کے گلے میں ڈال دیا۔ میں نے کہا۔  
 ”اب حق دار کو حق ملا ہے۔“  
 ”جی کیا مطلب؟“ نامرہ نے کچھ نہ سمجھ کر کہا۔  
 سائلہ سب سمجھ گئی۔ غلطی اس نے کی تھی۔ اس نے کہا۔  
 ”یقیناً بڑا نامرہ سے مذاق نہ کرو۔“  
 اور نامرہ سائلہ کی سادگی پر مسکراتی۔ کہنے لگی تھی  
 اور ارمان سے وہ بے خوف بن رہی تھی۔  
 پھر رکت کی عورتی مبارک باد دیتے آئیں۔ امی  
 ان کے ساتھ عقیق اور بڑی بہن کی تحشیت سے مبارک بادوں کا  
 سیلاب میری طرف اٹھ پڑا۔ ایسے بکولہ لنگا۔ بیسے مبارکباد  
 کے الفاظ کے ساتھ میرا سر جھڑکتا رہتا تھا۔ سائلہ نے کہا۔  
 ”میرا فاموش رہی۔ پھر کھانے کا دور چلا۔“  
 اکی نے پڑا پڑا کھانا پکھا تھا۔ سائلہ نے کہا۔  
 ”خوب خاطر تو ذبح کی گئی۔ اور تھوڑے کے ڈھیر میں بچیا اور  
 سائلہ کو خوب مبارکبادیں دی گئیں۔ بیجا مسکراتے رہے  
 تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آئندہ کیا حالات پیش آئے ہوں  
 ہیں۔ سب کو خود اعتمادی ملے گی۔ پھر اسے ایک نئی عالمی

اور نماز اٹھائے۔ میں نے دیکھا سائلہ اور بار میری  
 اور نامرہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں اس کے قریب لگی تو وہ  
 بولی۔ ”بڑی خوش دکھائی دے رہی ہو آج۔“  
 ”ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”خوش کیوں نہ ہوں بھیا کی  
 شادی ہو رہی ہے۔ جیسے نئی بھابی بنے گی۔ مگر تم اس شادی  
 کے سخت خلاف تھیں۔“ سائلہ نے حیرت سے کہا۔  
 ”ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”مگر اب کیا ہے۔“  
 سب کچھ سوچا تو حالات سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔  
 ”اور نامرہ بھی ناراض دکھائی نہیں دیتی۔“  
 سائلہ کی حیرت بڑھ گئی۔  
 ”وہ کیوں ناراض ہونے لگی۔“ میں نے جواب دیا۔  
 ”وہ پڑھتی لکھتی روشن خیال اور سمجھ دار ہے۔ میں  
 نے اسے سمجھا دیا ہے۔ اس نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا  
 ہے۔“ ”بڑی اچھی ہے نامرہ۔“ سائلہ نے جواب دیا۔  
 ”ہاں۔“ میں نے کہا۔  
 نامرہ بھی قریب آگئی۔ اس نے کہا۔  
 ”مبارک ہو سائلہ بہن۔“  
 عرصہ کے بعد اس نے شاید سائلہ سے پہلی بار بات کی تھی  
 سائلہ مسکرائی۔ اس نے نامرہ کا ہاتھ تھام لیا۔ اور



”تو کیا میں غیر ہوں۔۔۔۔۔ تم لوگ آخر کیا چاہتے ہو؟“  
ای کی کو غصہ آگیا۔

”امی۔۔۔۔۔ بھائی جان بھی چلا اٹھے۔“ آپ نے  
کبھی نامرہ سے اچھا سلوک نہیں کیا۔۔۔۔۔ نامرہ خود  
بالغ اور تیام یافتہ ہے۔ وہ اپنی زندگی کا خود فیصلہ کر سکتی  
ہے۔۔۔۔۔ آپ کو اس کے بارے میں کوئی غم نہ کرنے کا  
حق حاصل نہیں ہے۔۔۔۔۔ اب ہم میں جیسا کہ کہتا ہوں یہ وہ نامرہ  
میر کی بیٹی ہے۔

اب بھائی جان رنج سے کیا فیصلہ کریں۔۔۔۔۔ میں نے  
سائنس روک کر سہا پنا۔۔۔۔۔ کبھی دعا کی کہ امی میں اس کا نہ ملا  
دیں۔۔۔۔۔ نامرہ کا بھی رنگ فق ہو گیا۔۔۔۔۔ وہ  
بھائی جان کا فیصلہ رد کر سکتی تھی۔ بھائی جان نے کہا۔  
”مجھے یہ رشتہ منکر اور نہیں ہے۔“

”نگہ کیوں جو لڑکے کی ماں اور امی چلا گئی۔“

”آہستہ بات کیجیے۔ بھائی جان بے حد غصے میں ہو رہے۔  
۔۔۔۔۔ میں کیوں کا ہوا ہا دینے کا پابن نہیں۔ کہہ دیا رشتہ  
پسند نہیں۔ اور نامرہ ابھی شادی کرنا نہیں چاہتی بات ختم  
ہو گئی۔ اب پوچھنے کی کیا ضرورت رہ گئی ہے؟“  
بھائی جان نامرہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرے میں لے گئے

بھائی بھی نے کو سنبھالے ان کے پیچھے گئیں۔

میں نے دیکھا بھیا امی کے پیچھے کھڑے ہو کر رہے  
تھے۔ نامرہ نے بہت اچھا کیا تھا۔ اس نے حالات سے نمٹنا  
سیکھ لیا تھا۔ ورنہ امی نے تو سب کچھ لگا کر دیا تھا۔۔۔۔۔  
ابا نے جب سنا تو امی کو جھوٹا کیا کہ وہ سیم ٹھیک کرتا ہے۔  
بشر دیکھ بھالے ہاں کرنے میں امی نے غلطی کی تھی۔۔۔۔۔  
ابھی کیا علم تھا کہ حالات کیا رخ اختیار کریں گے۔  
چند روز بعد سائمن اپنے ابا کے ساتھ چلی گئی شادی  
کی کوئی تاریخ مقرر نہ ہوئی تھی۔ اور بھیا نیز مالک میں تعلیم  
حاصل کرنے کے لئے وطن کی ملک دو کر رہے تھے۔







آنے کے بعد آپ کا ہر حکم مان لوں گا۔

ابا تو خاموش رہتے مگر ابا گویا سچا پڑیں۔

”ایسا بزرگ نہیں ہو سکتا۔ اگر اتنے طرحی کے لئے جانا ہے تو شادی کر کے جانا چوگا۔ میرا دل بھی مشتعل رہے گا میری بہو تو میری آنکھوں کے سامنے رہے گی۔“

”ایک سو ہے بولے دیکھ لیا کچھ بے گات۔“

بھیا نے مسکرا کر کہا۔

”اس اپنی جگہ ہے۔ اور یہ تو میری بیٹی ہے کتنا ارادہ ہے مجھے کہ اسے جو بن کر گھر میں لادوں۔“

”اسی نے تصور ہی تصور میں کشیش غصے بنایا۔ بھیا

اسی کی چاہش دیکھ کر خاموش رہ گئے۔ بھیا کی جان جو سمپ

بغیر سن رہے تھے اگلے

دو عینک کہتا ہے اہم شادی کر کے ملازمت میں جانا

خاصہ بہنیں۔ بہن تو یہ ہے کہ وہ ملک ہی میں رہا جائے

اس طرح یہ پوری اطمینان سے نہ پڑھ سکے گا

شادی والیسی پہنچتی رہے گی۔“

چنانچہ ابا اور امی نے نہ صرف لڑن سبائے

کی اجازت دے دی۔

بلکہ شادی کے بارے میں بھی فیصلہ ہو گیا

ابا نے بھیا کو لڑن کی آخر وقت کا خرچہ دینے کی حاسی

بھری۔

بھیا خوش ہو گئے۔ شام کو انہوں نے نامہ رز کو سہا پہلو

دی اور کہا۔

”اب تمہاری روانگی کا مسئلہ ہے۔“

”وہ بھائی جان طے کر لیں گے۔ بھیا نے جواب دیا۔

”مگر کب؟“ نامہ رز بے تاب ہو گئی۔

”میرا ان سے بات کرتے ہیں۔“

بہتر ہے کہ تم خود بات کرو۔

بھیا نے جواب دیا۔

”تو یہ بات کریں گی۔ میں اچانک درمیان میں کھڑا

پڑوں۔“

”بہنیمہ باجی!۔۔۔ نامہ رز نے کہا۔۔۔ میں

آپ کر سکتی ہیں۔ چنانچہ میں نے اسی وقت بھائی جان سے

بات کی۔

بھائی جان نے کہا میں ابھی ابا اور امی سے بات کرتا

ہوں۔ چنانچہ وہ اسی وقت ابا اور امی کے پاس گئے۔ انہوں

نے ادھر ادھر کی باتیں کر کے کہا۔

”میں نہ تو کوئی تعلیم کے لئے لڑن نہیں کرنا۔“

”کیا کہا؟“ اسی چونک پڑیں ——— وہ بھی میرے بیٹے کے ساتھ جائے گی — میں ایسا نہ ہوں نے دوں گی؟

”مگر یہ اس کا حق ہے؟“ بھائی جان نے کہا —

”اسے بھی شوق ہے کہ وہ مزید تعلیم حاصل کرے۔ اور میں اس کی خوشی کے لئے ایسا کرنا چاہتا ہوں۔“  
”تو تسلیم نہیں جائے گا۔“

اسی نے غصہ کر دیا۔

”اما ——— بھائی جان نے کہا ——— کوئی حرج نہیں۔“

وہ نوا جائیں گے۔ اور بہن بھائیوں کی طرح اسی طرح وہاں پڑھیں گے جیسے یہاں پڑھتے رہے ہیں۔ — یقیناً مگر وہ تسلیم آپ کا کرنا ہے۔ اور آپ زیادہ جانتی ہیں۔ کہ وہ کوئی غلط قدم نہیں اٹھائے گا۔“

ہاں ہاں ——— ”ابا نے کہا ———

”کوئی حرج نہیں۔“

دسیم کی خواہش یہ تھی تو ایسا ہوتا چاہیے۔ رسم کی ماں تم خاموش رہو۔ — بھوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ جو ان اولاد سے زیادہ بحث اچھی نہیں ہوتی۔“

اسی خاموش ہو گئیں اور بھائی جان نے بھی

خوش ہوئی۔ سناؤ کہ سب ان گئے ہیں۔ ———

”نامہ اور بھیا زور شور سے لڑن جانے کی تیاری کرنے لگے۔ سب کام سب مشاغل ہوتا چلا گیا۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ قدرت بھی ان پر مہربان ہے۔ میں ان کے معاملات میں سب سے زیادہ دلچسپی لے رہی تھی۔ ——— اور میرا ہی حوصلہ تھا کہ میں نے سب چکر چلا دیا۔ مگر جب سوچتی تھی کہ ایک مدت کے لئے بھیا اور نامہ مجھ سے بھڑ ہو جائیں گے۔ تو میرا دل دھک سے رہ جاتا۔ ——— مگر ان کی خوشی کے لئے یہ ضروری تھا کہ سہانی برداشت کی جائے۔“



افسانہ کے پچنے کی امید نہ تھی — جب انہوں نے  
سنائے کہ سلیم لندن جا رہا ہے۔ تو انہوں نے ابا کو خط لکھا کہ۔

”میں ایک مڑھے سے بیمار ہوں۔ نہ جانے کب

میری زندگی کا چرغ بجے جائے۔ میں نے زندگی بھر میں ہی ایک  
بچی دیکھی ہے۔ اس کی خوشیاں میری زندگی کا سرمایہ ہیں۔ اگر  
میں اسے اپنے ہاتھ سے دلہن نہ بنا سکا تو یہ حسرت دل میں  
لے جاؤں گا۔ آپ براہِ مہربانی سلیم کے جانے سے پہلے شادی  
کر دیں۔ لڑکھوؤں نے مجھے جواب دے دیا ہے۔ مجھے سرطان کا  
مرض ہے۔ اور میں اتنا طریم زندہ نہیں رہ سکوں گا  
کہ سلیم کی واپسی کا انتظار کر سکیں۔“

سانہ کے ابا واقعی شدید بیمار تھے۔ اس نے کوئی  
بھی ان کی بات رد نہ کر سکا۔ اس شام جب بھیا گھر آئے تو  
ابا نے ان کو بلا کر کہا۔

”بیٹے تمہارے ہونے والے سسر کا خط آیا ہے  
وہ بے حد بیمار ہے پچنے کی امید نہیں۔ اس نے زور دیا ہے  
کہ شادی جلد کر دی جائے۔ تاکہ اسے بھی خوش نصیب ہو۔  
دیکھنا نہ نہیں کرنا۔ میں نے بڑے مان سے یہ بات کی ہے  
مگر ابا جان نے مجھ سے کہا ہے۔ ایسا کیسے ہو گا؟  
میں واپس پھر سب کراؤں گا۔“



ہم سب لوگ اپنا اپنی جگہ خوش تھے۔ اور ناصر و بھیا  
کے لندن جانے کی تیاری میں مصروف تھے۔ اور دونوں جوان  
دھڑکتے ہوئے دل ایک ہو جانے کو بے تاب تھے۔  
مگر تقدیر ہمارا ملاقاتی اٹارہتی تھی۔ ہم نے جو سوئی  
قلعہ بنائے تھے وہ پورے پورے دکھائی نہ دیتے تھے۔ کیونکہ  
درمیان میں ایک اور مصیبت نے جنم لے لیا۔  
سانہ کے ابا جب سے لندن سے آئے تھے۔ وہ بیمار  
تھے۔ ان دنوں ان کی بیماری شدید ہو گئی تھی۔



”مگر یہ بڑی ناز پر لقمہ نہیں۔ لوگ ہم پر یہ سب سے سختی  
بھیجیں گے۔ اور اچھے لفظوں سے یاد نہیں کریں گے۔“  
”پر وہ نہیں۔“

بھیا نے کہا۔۔۔۔۔ اگر کوئی یاد کرتا ہے۔ تو کرنے  
دو۔۔۔۔۔ ہمیں اپنے کام سے مطلب ہے۔ اگر میرے  
طریقے سے کام نہیں چل رہا تو اسے الٹے طریقے سے کرنا ہو  
گا۔ کیوں رضیہ باجی شیک ہے نا؟  
”ہیں اس کے حق میں نہیں۔“ میں نے کہا۔

”نہیں بھیا۔ یہ درست نہیں ہے۔ یہ سائلہ سے  
دھوکا اور زیادتی ہے۔ رحمت پیدا کرو اور مالک کر دو۔  
مگر ایسا نہ کرو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو میں تمہاری سب  
سے بڑی محنت ہو جاؤں گی۔“

”آپ؟“۔۔۔۔۔ نامہ نے چونک کر کہا۔  
”ہاں نامہ۔“

میں نے کہا۔۔۔۔۔ ”مجھے ملنا  
نہ سمجھنا۔۔۔۔۔ میں وہ خوشی حاصل کرنے کی قائل نہیں ہو سکی  
اور کی خوشیوں کے مزار پر کھڑے ہو کر حاضری ہو۔۔۔۔۔  
سائلہ کو تباہ کر کے آپ اپنا گھر آباد کریں گے۔ یہ تو دنیا کی  
سب سے بڑی بے انتہائی ہوگی۔ اور قدرت بھی اسے

میں نے مداخلت کی۔

”او آؤ رضیہ باجی۔ بھیا نے یوں کہا جیسے میرا ہی  
انتظار کر رہے ہیں  
پھر وہ بولے۔

”نامہ میں اگر ماں باپ کا دل توڑ کر لٹاؤں جاؤں  
گا۔ تو ان کی دعائیں کے کہ نہیں بڑھائیوں کے کہ جاؤں گا۔  
اور کسی کام میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ یہاں  
یہ لوگ صرف سائلہ سے میرا نکاح کر رہے ہیں۔۔۔۔۔ یہ  
”نکاح ہی تو اصل بات ہے۔“

”نامہ درمیان میں بول پڑی۔

”شک ہے۔۔۔۔۔ بھیا نے جھرا ب دیا۔

میں مردہوں۔۔۔۔۔ مردوں کی ایک وقت میں چار  
شادیاں کرنے کا اختیار ہے۔ میں لندن میں نامہ سے  
شادی کروں گا۔ اور پھر کبھی پاکستان واپس نہیں آؤں گا۔  
میں وہیں سے سائلہ کو طلاق بھیج دوں گا۔ اس سے زیادہ  
کرنا میرے اختیار میں نہیں کیوں نامہ  
نامہ ایک دم خلعوش ہو گیا۔

وہ کچھ سوچ رہی تھی۔

پھر اس نے کہا۔

صاف نہ کرے گی۔

”مگر میں نے جو فیصلہ کیا ہے وہ عزم پر ہو گا۔“

بھیا کو غصہ آگیا۔

”بھیا فلا کے لئے ذرا غور کرو۔ آپ کیا کہہ رہے

ہیں؟“ میں نے کہا۔

”خاندان بھر کو روسوا کر دانا ہے تو ایسا کرو۔ یاد

رکھو تم ہماری سبب کی زندگی میں زیر بھر دو گے۔“

”بابی“ بھیا نے لفظ پر زور دے کر کہا۔

”یہ سبب آپ کا مشورہ ہے۔ اور سامنے

اس کا اس کے علاوہ اور کوئی حل نہیں۔ میں مجبور ہوں۔

”مگر ایسا نہ ہو گئے گا“ میں نے کہا۔

”سائے فلاح نہیں ہو سکتا۔ میں خود بھی مر جاؤں گی

اور اسے بھی ہلاک کر دوں گی۔“

”میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔“

میں بڑبڑاتی رہی۔

جذبات و خیالات کا طوفان تھا۔

جو غصے گھیرے ہوئے تھا۔

اور میں سائے کو تباہ کر کے بھیا کو آباد

کرنے کو کسی صورت تیار نہ تھی۔

میں تو صرف اس قدر چاہتی تھی کہ سائے سے نکاح ہی نہ

کیا جائے۔ یہ کہاں کا انصاف تھا کہ زہرہ سے شادی کے

لئے سائے کو اتنا زبردست دھوکا دیا جائے کہ اس سے

نکاح کر کے اسے ٹھکرا دیا جائے۔ آخر اس کا قصور کیا تھا۔

”مگر میں شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔“ گو

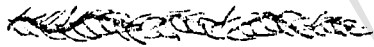
مختصانہ ہو یا تھی مگر چند روز بعد بھیا کی برات سائے کے گھر جانے

والی تھی۔ بابا نے کارڈ پھینے بیچ دیئے تھے۔

اور اب حالات ہمارے قابو سے باہر ہو چکے تھے۔

۔۔۔ یہ سب بھیا کی غلطی تھی۔ کیونکہ ان میں اتنی اجبرأت نہ

تھی کہ بااِدرای سے منکر لیتے اور اپنی بات منوا لیتے۔



بایکٹاٹ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ میں نے ایک روز ای سے  
صاف صاف بات کرنے کی ٹھان لی۔ تنہائی میں جا کر میں نے ای سے کہا  
”ای ایک بات کہوں۔“

”ہاں بیٹے کہو۔“ ای نے پیار سے جواب دیا۔

”دیکھا تو چاہا کہ ای سے کچھ نہ کہوں۔ اور اس پیار کے جواب  
میں سختی پیدا نہ کروں مگر پھر میں نے دل پر جبر کیا اور بولی۔  
”کسی پر ظلم کرنا کیسا ہے؟“

”بہت بُرا۔ مگر بڑا تم کیوں پوچھ رہی ہو۔“  
ای نے جواب دیا۔

”اس لئے کہ آپ مجھ پر ظلم کر رہی ہیں۔“

میں نے جواب دیا۔

”کیسے؟“ ای کا موڈ خراب ہو گیا۔ ”میں ماں ہوں اور اپنے بیٹے  
پر ظلم کیوں کرنے لگی۔ زمین بیٹی تم بعض اوقات کیسی باتیں کرنے لگتی ہو؟  
”ای نہیں نے تلخی بھری آواز میں کہا ”جیسا امرہ کو پسند کرتے ہیں  
اور میں نے اپنے کانوں سے سنایا کہ انہوں نے شادی کا وعدہ کیا تھا۔“  
”کیا کہا؟ ای چونک پڑیں۔“ یہ گھریبے عجیب رخا۔ میں یہاں ایسی  
آواز کی برداشت نہیں ہو سکتی۔

”سیلم کو کیا حق حاصل ہے کہ ایک مردارہ اور بد بچہ کو لڑکی کہہ کر  
بہو بنانے کا وعدہ کرے۔ یہ ہمارا کام ہے۔ اور تم کنواری



بھول جوں شادی کا دن قریب آ رہا تھا۔ میرا اضطراب  
بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے لاکھ کوشش کی کہ کوئی ترکیب نکالوں  
جس سے شادی ٹل جائے مگر میں مجبور تھی۔ بھلا کیا ترکیب ہو سکتی  
تھی۔ جس سے میں شادی کو ٹال سکتی۔ اور مجھے معنوم تھا۔ کہ جس  
طرح مجھ باقی حالات میں بے بس رہے ہیں۔ اسی طرح وہ معاملہ  
میں نکاح کے بعد اسے قبول کر لیں گے۔ کیونکہ امی کی بھی مرضی تھی۔  
میں نے اپنے اپنے غور و مشورہ کے ساتھ فیصلہ کر لیا۔ دیکھتے تھے۔ میں نے  
میں نے اپنے اپنے غور و مشورہ کے ساتھ فیصلہ کر لیا۔ دیکھتے تھے۔ میں نے  
میں نے اپنے اپنے غور و مشورہ کے ساتھ فیصلہ کر لیا۔ دیکھتے تھے۔ میں نے



"سکون آپ کی ضرر سے بچنا ہے۔ میں نے جواب دیا۔  
"میں نے کہا ہے کہ اپنے کمرے میں پہلی جاؤ۔ اور اب مزید  
بحث نہ کرو۔" اسی چٹائی۔

"اچھا جانتی ہوں۔ میں نے بھی اس طرح بلند آواز میں  
جواب دیا۔ مگر یاد رکھیں اگر آپ اپنی ہسٹ کی پکی ہیں تو میں بھی  
آپ کی بیٹی ہوں۔۔۔۔۔ میں اس شان میں  
شرکت نہیں کروں گی۔"

اسی کو نئے فکرنے پھر گئے۔ اور بھابی نے بھی  
اعلان کر دیا کہ وہ میرا ساتھ دیں گی۔۔۔۔۔ کیونکہ ان کو  
بھائی جان کی حیثیت حاصل تھی۔۔۔۔۔ میں تیزی سے اپنے کمرے  
میں جا رہی تھی۔ کہ راستے میں مجھے بھیا مل گئے۔  
انہوں نے سب سن لیا تھا۔ انہوں نے مجھے روک  
کر کہا۔

"شکریہ رضیہ باجی۔ آپ نے واقعی بے حد ساتھ دیا ہے  
مگر آپ نے یہ راز فاش کر کے کہ میں سائلہ کو پھوڑ دوں گا  
اچھا نہیں کیا۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور پھرتی سے  
اپنے کمرے کی جانب چلی گئی۔۔۔۔۔ بھیا میرے پیچھے آئے  
انہوں نے کہا۔

لڑکی سو۔۔۔۔۔ تم بھی اسی سائلے میں داخل ہو۔  
"دنیا کی زبان بند کرنا مشکل رہتا ہے۔" بھیا کہتا ہے۔ "میں نے جواب دیا  
"اس راج کا جو فیئر نکلے گا وہ بہت خوفناک ہو گا۔  
"کما فیئر ہو گا۔" اور کما فیئر لگیں۔

میں نے یہ سوچا کہ جیسا سائلہ کو پھوڑ کر ناموس سے اپنی مرضی سے شادی کر لیں  
گئے۔۔۔۔۔

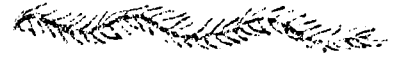
"ورنہ کیا ہا اسی نے بے قراری سے کہا۔  
"ورنہ وہ پگلی ہو جائیں گے۔ میں نے جواب دیا۔  
میں بھی ڈاکٹر تھی۔ اسی بات کا مطلب مد جان سکیں اور فکر مند  
سے ہو لیں۔

"اب کیا ہو گا رضیہ بیٹی۔ سب کام ہو چکا۔  
"شادی ہو گئی۔ میں نے سبھا شاید تیرنشا نے ہر پڑا  
ہے۔

"ہاں۔ اسی پادری سے میری زندگی بچا اسیاں ہو سکے گا۔  
سائلہ اس کو بھی گھوڑے لگی  
اور سائلہ کی بھابی نے کہ وہ شادی سے اس کا کرے۔ خلاقی مفرہ  
کا جو کیا سوال ہے۔۔۔۔۔ تم جاؤ اور اپنا کام کرو۔  
میں ناموس کو تیر دے دوں گی۔ اس نے سارے گھر کا سکون  
چھین لیا ہے۔"



کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔  
 میں جیسے راز فہم کر مٹی ہو کبھی کسی معاملے میں دخل نہیں  
 دیا کرتی تھی۔ اس شکار کے خلاف تھی۔ اتے بھی احساس  
 ہو گیا تھا کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔



ہسپتال میں بھیا اور نامہ ایک دوسرے سے الگ کیسے  
 رہ سکتے تھے۔ جبکہ دونوں الگ ہی وارڈ میں ملازم تھے۔ بھیا  
 جنہیں نامہ سے بے حد پیار تھا۔ جب ہسپتال میں نامہ کو  
 رخصت اور اس دیکھتے تو ان کے دل پر پھوٹ سی لگتی۔ نامہ سے  
 تو گویا سبھی خوشیاں اور مسکراہٹیں چھن گئی تھیں۔ اور وہ بھیا سے  
 کھل کر بات بھی نہ کرتی تھی۔ اور راز ان کا سامنا کرتی تھی۔ ایک نظر  
 ان کو دیکھتے۔ کسی مرلین کو ایڈمز کرتی اور نظریہ کیوں گزر جاتی  
 جیسے انھیں بھیا سے کوئی الجھا نہیں ہے۔ اور بھیا ایک  
 بڑے سے اس کی اداسی اور بے قرار سی تہ اس کے دلی



اور ایک انگ دنیا ہوگی۔۔۔۔۔ یہ لوگ ہمارا کیا بکھڑا رہیں گے۔۔۔۔۔ ہمیں اب کسی کی عزت نہیں۔۔۔۔۔ اور نہ کسی کو ہماری عزت ہے۔۔۔۔۔

”گھر۔۔۔۔۔ نامہ نے کہا۔۔۔۔۔ گھر والوں کی بدنامی ہوگی۔۔۔۔۔ لوگ ہمیں ہمیشہ بُرے نام سے یاد کریں گے۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“ بھیا نے جواب دیا۔  
”کیا آپ یہ سب برداشت کر لیں گے۔ آپ کو گھر والے ماں باپ۔ بھائی بہن سب ہمیشہ کے لئے چھوڑنے ہوں گے۔۔۔۔۔ میرا کون ہے میں تو سب برداشت کروں گی۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ بھیا نے جواب دیا۔۔۔۔۔ میں سب برداشت کروں گی۔ اور جب تم ماں بن جاؤ گی تو میں تمہیں واپس لے آؤں گی۔۔۔۔۔ اور ہم آرام و سکون سے رہیں گے۔۔۔۔۔ گھر والوں کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ تب وہ ہمیں جدا بھی نہ کر سکیں گے۔۔۔۔۔ کیا تم ساخہ دو گی؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ نامہ نے جواب دیا۔

”تو کل تیار ہو کر آؤ۔۔۔۔۔“ بھیا نے کہا۔

کل ہم یہاں نہیں ہوں گے۔ اور کل کے بعد ہم میاں بیوی کی حیثیت سے نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔“

کسی سریشی کی طہمت زیادہ خراب تھی اس لئے

انہوں نے بھیا کو بلایا تھا۔ پٹنا چہ بھیا کرے سے چٹے گئے اور نامہ بھیا سے شادی کے خوابوں میں کھو کر رہ گئی۔۔۔۔۔

اس نے خود کو دہن محسوس کیا۔۔۔۔۔ اور اسے یوں لگا جیسے وہ جلد بروسی میں بیٹھی ہے۔ اپنے دونوں کے انتظار میں جہاں اس کا مجازی غذا اس کا کھانگٹ اٹھائے گا۔

اور اس سے آہستہ سے کہنے لگا۔

”تم کتنی خوبصورت ہو۔۔۔۔۔ نامہ۔۔۔۔۔ میرا

دل چاہتا ہے تم یوں ہی رہو۔۔۔۔۔ اور ہر تین مہینہ دیکھتا رہوں۔۔۔۔۔ اور وہ آنکھوں پر پانچہ رکھ لے گی وہ بھیا کی نظروں سے کیسے نظریں ملا سکے گی۔؟

وہ مسکرا دی۔۔۔۔۔ اور اس نے آنکھوں پر پانچہ رکھ لئے۔ اچانک میں پیچھے اٹکی۔۔۔۔۔ اپنے وارڈ سے چھٹی کے بعد میں اکثر کمرہ کے پاس آجاتی تھی۔۔۔۔۔ میرے آہستہ سے کہا۔

”بہت خوش ہے آج میری بہن۔“

وہ شرمیلی میں نے پوچھا۔

”کیا بات ہے؟“ یہی جی بتانا تاکہ ہم بھی مسکرا سکیں

وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ اور مجھے بازوؤں میں خوشی سے

گھما کر لولی۔

”ایک بات ہے۔“

بھی حیران تھی۔ ہر وقت اداس رہنے والی ناصرہ

ایک دم کیوں خوش ہو گئی تھی؟ آخر کوئی تویات تھی۔

”کیا بھیا نے کوئی نئی سکیم بنائی ہے۔؟“ میں نے دراز

داری سے پوچھا۔

”ہاں۔ اس نے اسی قدر کہا۔“

”کوئی نئی سکیم ہے؟ میں بھی تو سنوں؟“ میں نے

پوچھا۔

”ایک ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ پھر

بتاؤں گی۔ چند روز بعد۔“

”مگر اب مجھ سے کیا پردہ۔ کیا میں کسی کو بتاؤں گی؟“

میں نے کہا۔

”نہیں باجی۔ اس نے جواب دیا۔“ آپ مجبور نہ

کریں۔ کل آپ کو خود خود پتہ چل جائے گا۔“

میں نے اسے مجبور نہ کیا۔ اس نے کہا۔

”اُس کرم کھاؤ گی باجی۔ آج میں آپ کی خاطر کرنے

کے امور میں ہوں۔“

منزور کھاؤں گی۔ میں نے جواب دیا۔

اور ناصرہ اُس کرم کھاوانے کے لئے ملازم کی

تلاش میں چلی گئی۔

میں سوچنے لگی آخر وہ کیا ترکیب مکنی ہے جس سے

انہوں نے اس قدر خوشی حاصل کی ہے۔ اور پھر مجھے وہ

شعریاد آگیا جس میں شاعر نے محبت کرنے والوں کا بے وقوفی

کا بڑے اچھے انداز میں نقشہ کھینچا تھا۔ کہ

میں اور مٹی کے کھالوٹوں سے بہل جاتے ہیں لوگ۔

اور شاید وہ بھی ایسے ہی کچے پروگرام سے بہل

گئے تھے۔

ناصرہ اُنکس کرم لے آئی۔ اور ہم اُنکس کرم کھانے

لگیں۔ پھر میں نے کہا۔

”مگر ابھی کھاؤ گی نا؟“ میں نے کہا۔

دیا۔ میں تمہارے بھیا سے مل کر آؤں گی۔ آج جاہل ہیں آدھ

گھنٹے بعد آؤں گی۔“

”بہتر ہیں نے جواب دیا مجھے معلوم تھا وہ کوئی خاص

پروگرام بنانے کے لئے ملیں گے۔ میں گھر آگئی۔ آدھ گھنٹے

کے بعد ناصرہ بھی آگئی۔ وہ تھکی ہوئی تھی۔ اس نے کچھ بھی نہ کھایا

وہ بے حد خوش تھا اس لئے کچھ کھانے پیٹے بغیر سو گئی





بسج جب میں سوکراھٹی تو سنی ۔ یہ پوچھا ۔

میں تباہے بغیر جانے کی معذرت چاہتی ہوں۔

نامہ ہر روز صبح بخیرے جگایا کرتی تھی۔ اور ہم بیدار  
 اٹھ کر پرایا کرتی تھیں اور پھر ایک درگزر کے ساتھ لیٹ جاتیں اور  
 خوب خوب باتیں کرتیں۔ بہت دنوں سے یہ ہماری رات بن گئی  
 تھی۔ اور اسی روز اس کا نہ آنا مجھے بہت محسوس ہوا  
 ”جی وہ تو صبح سویرے اپنا سرٹ کیس لے کر ہسپتال

جلی گئی ہیں۔

میں نے جواب دیا اور ہجاک گئی۔

”اس کی کیا عزت تھی؟۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ نام نہ نہ۔۔۔

مہربانی۔ یہ بھی کیا کم خوشی ہے۔ کہ تمہیں تہاری منزل مل رہی ہے  
 کاثر تم پر مہلے بیٹا دیتیں تاکہ میں خود تم سے رخصت کرتی۔

میں سمجھتی تھی کہ جب اہل اہل باقی سب کو پتہ چلے گا کہ بیباک ناصر کے ساتھ جھگ گئے۔ تو گھر پر قیامت ٹوٹ پڑے گی اور حالات کتنے خراب ہوں گے۔ مگر اس کے باوجود میں نے خود سے

- ۴ -

ہا جیسا تم نے اچھا کیا۔ — تمہیں ایسا کرنا چاہیے تھا۔

کیونکہ تم بزدل ہو۔۔۔ اور بزدلوں سے ایسی ہی توقعات ہوا کرتی ہیں۔

جب مجھ پر اور ناصر ضروری سامان سمیٹے کہ ٹھہرے روانہ

ہوئے تو انہوں نے میرے علاوہ اور کسی نام سے کوئی اخلاص

نہ جھوٹھی۔۔۔ بھیا اور ناصرؔ ہر ہسپتال میں ایک دوست

ڈاکٹر سے ملے اور ہماری بات اسے بتادی اور خواہش

نہا، ہر کسی کہ وہ ان کی مدد کرے۔ انہوں نے دو ماہ کی چھٹی کے

میں نے درخواست دے دی اور اپنے دوست سے کہا کہ وہ

کارمیں انہیں ایک ایسی جگہ ملے جائے۔ جس کا انہوں نے

خود انتظام کر لیا تھا۔ ضابطہ وہ کار میں دوسرے شہر

روانہ ہو گئے۔

وہ نے حد خوش بختی۔ ان کی منزل انہیں ملنے والی تھی

ایمانک سامنے سے ایک ٹرک سے جب وہ بچنے لگی تو ایک دوسری کار نیچے سے ان کی کار ٹکرائی۔ حادثہ زبردست تھا جس میں انہیں معمولی چویش لگیں۔ جبکہ گاڑی تباہ ہو گئی۔

ادرناکارہ ہو کر رہ گئی۔ بھیا کے دوست ڈاکٹر کو نیزہ یادہ چوٹیں

لیں۔ ایک راستے سے گزرنے والی نے انہیں ہسپتال پہنچایا۔

جہاں عیسا کے دوست کو طبی امداد دی گئی۔

— اور جیسا اور نامہ کی مرہم مٹی کی گنتی — جیسا کہ

بازو دیا اور ناصرہ کے سر میں جھوٹائی تھی۔ — عمارت

منہر سے پتے عیسٰی میں دور ہو ا تھا۔۔۔۔۔ شام کو بھیا اور

ناصرہ شہزادے کو وہ زخمی تھے ————— انا اور امی بھائی

سحان اور سب گھر پر موجود تھے۔ بیساکو بیسی ماند سے دیکھ کر ای

ان کی طرف لکس۔ جسکے صائی خانہ ادمکھتے ٹریسے ہم نے درنہں

کا حال معلوم کیا —————معمولی جوڑ میں تھیں۔

بھپائے کہا۔

۴۰۔ اباحان ابھی شام کو حبس میں اور نامہ ریح فارغ ہو

کر گھرا رہے تھے کہ رکشہ الٹ گیا۔ اور میں جہ میں آئی ہیں۔

وہ سامان ساتھ نہ لائے تھے۔ اس لیے اب وہ



تھے؟" ابانے پوچھا۔

"اباجان!۔۔۔ بھیا نے جواب دیا۔۔۔" ہم  
ڈاکٹر ہیں اور مرلیضوں کو دیکھنے کے لئے جانا ہمارا کام ہے  
میرے دوست ڈاکٹر کی بہن کو کوئی زمانہ بیمار ہی تھی۔ اس  
نے نامرہ سے کہا تھا کہ وہ اسے ان کے گھر جا کر دیکھے وہ کار  
میں نے جانے گا۔ اور کار میں چھوڑ جائے گا۔ میں نے  
نامرہ کو تنہا بھیجنا منہ سب خیال نہ کیا۔۔۔ اور خود اس کے  
ساتھ گیا مگر خدا کا کرنا یہ سوا کہ راستے میں یہ حادثہ پیش  
آگیا۔۔۔

بات منقول تھی۔۔۔ اور بھیا نے خوب خوب جھوٹ  
بولانھا۔۔۔ چنانچہ ابامطمن ہو گئے۔ ورنہ اصل حقیقت  
ان پر عیاں ہو گئی تھی۔ اسی شام جب نامرہ اور  
بھیا اپنے زخمی ساتھی کو دیکھنے گئے۔ تو اس نے پوچھا۔  
"اب کیا خیال ہے ڈاکٹر۔۔۔ مجھے اندر سے  
بے میراں وجہ سے تم بھی مصیبت میں پھنسنے۔ میرے حادثہ  
کر دیا۔ اور آپ کا پروگرام خراب کیا۔"

"جی نہیں۔۔۔ بھیا نے جواب دیا۔۔۔  
آپ کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔۔۔ دراصل ایسا  
قسمت میں لکھا ہوا تھا۔۔۔ ہم لوگ یوں فرما رہے

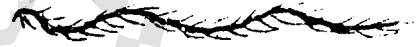
لباس کون سا تبدیل کرتے۔ خون آنسو لباس پہنے وہ گھومتے  
رہے تھے۔ امی نے کہا۔

"ایئرہ سے رکشے میں بیٹھا ہی نہ کرو۔ جہت ہی  
غلط سواری ہے۔۔۔ اب ذرا منہ ہاتھ تو دھو لو  
اور کپڑے بدل لو۔"

تب بھیا اور نامرہ کو یاد آیا کہ وہ سوٹ کیس تو ہسپتال  
میں بھول آئے ہیں۔۔۔ میں نے ان کی پریشانی مٹانے  
لی۔۔۔ میں کہہ رہا تھے سے تم کو ساتھ لے کر ہسپتال  
پہنچی اور وہاں سے سوٹ کیس لے آئی۔۔۔ دونوں  
نے لباس تبدیل کئے۔ میں نامرہ کے کمرے میں لگی اور اس کا  
سر دبانے لگا۔ مگر اس نے انکار کر دیا۔۔۔ تب میں نے  
اس سے ساری باتیں پوچھیں۔۔۔ مگر صبح جب گھر  
میں اخبار آیا تو اس کے صفحہ اول پر اس حادثے کا خبر تھی۔  
۔۔۔ بھیا۔ نامرہ اور ان کے دوست ڈاکٹر کا نام لکھا ہوا  
تھا۔۔۔ ابانے اخبار پڑھا تو سکتے میں رہ گئے۔  
وہ بھائی جان کو لے کر بھیا کے کمرے میں پہنچے اور بیٹے۔

"سلیم ایک بات سچ بتاؤ؟  
فرمایئے۔۔۔ سلیم نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔  
"تم لوگ کار میں کل حادثے کے وقت اٹھ کھان جا رہے

جانتے تو شاید یہ اچھا نہ ہوتا — اس لئے اب  
 میں اس کو دہرانا نہیں چاہتا —  
 چنانچہ جیسا اور نامرہ نے پھر یہ پروگرام بنایا کہ  
 ملک سے باہر جا کر ہی شادی ممکن ہے۔ جیسا کہ نکاح ہوتا  
 ہے تو ہوتا رہے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔



اسی شام ابا نے نامرہ کو بلایا۔ وہ اپنے کمرے میں  
 تھی۔ اس دن خلافت مہرول اس کا سوڈ بے حد خراب تھا۔  
 ابا نے کہا۔  
 ”نامرہ بیٹی میں تم سے ایک مشورہ کرنا چاہتا ہوں  
 کیا تم سنجیدگی سے جواب دے گی؟“  
 ”جی کیوں نہیں؟ نامرہ نے جواب دیا۔“ آپ  
 نے جو کچھ پوچھا ہے پوچھیے۔“  
 وہ اب ایسی باتوں کی عادی ہو چکی تھی۔ اور اس نے کبھی ان

باتوں کا بڑا انداز تھا۔ اس نے سوچا اب انہوں نے بھیجے اور میرے  
تعلقات کے بارے میں بات کریں گے۔ اس لئے اس نے خود  
کو تیار کر لیا۔ مگر بابے اور بی بی بات کہہ ڈالی۔ بابے پوچھا۔

”میرے ایک دوست ہیں ان کا بڑا بہت بڑا امیری آفیسر ہے  
انہوں نے مجھ سے تمہارا رشتہ مانگ لیا ہے۔ میں نے انہیں انجھی کوئی جواب  
نہیں دیا۔ اب تم بتائی کہ میں کیا کروں۔ مگر بار بھی اچھا ہے۔ لڑکا  
صحیح منہ۔ خوبصورت صاحب جاگیر اور پڑھنا لکھنا ہے۔ مٹری  
میں آفیسر ہے۔ اور کیا چاہیے۔“

نامہ نے پہلے تو کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بابا لڑکا احترام کرتی تھی  
پھر اس نے کہا۔ ”جی ہاں شادی نہیں کریں گی؟“

”کیون بابا نے چونکہ پوچھا۔“

”نہیں نہیں کوئی شادی نہیں ہوگی۔ میرا آخری فیصلہ ہے۔“

”بیلی ساری زندگیوں کی رچنے سے کام تو نہیں چلیگا۔ غیر  
میں ان لوگوں کو بڑے جیتا ہوں۔ ان کو دیکھو تو شاید تمہارا خیال بدل جائے“  
بابا نے جواب دیا۔

”نامہ کو نہ بولی۔ دوسرے روز بابا نے امی سے کہا۔“

”کل ہمارے گھر نامہ کو دیکھنے مہمان آنے والے ہیں۔ ان  
سے بڑا اچھا سلوک کرنا۔ وہ نامہ کا رشتہ مانگتے ہیں

امی کی تو دنی خواہش تھی کہ وہ رشتہ ہو سکے نامہ ان کے

گلے سے پرے ہو۔ چنانچہ وہ یہ حد خوش ہوئیں۔ بھیلے سنا  
تو انہیں شدید مارا۔ بھیلے کی بات ہوئی کہ ان کی پسند کو کوئی  
دوسرا پسند کرنے آئے۔ چنانچہ انہوں نے نامہ سے کہہ دیا کہ  
ان لوگوں سے ملے ہی نہیں۔ مگر نامہ نے جواب دیا۔

”آپ فکر نہ کریں۔ میں ان سے ایسا سلوک کروں گی کہ  
وہ یاد کر جائیں گے۔ اور پھر کبھی اور کارخ نہ کریں گے۔“  
بابا نے جواب دیا۔

”گھر میں آنے والے مہمان سے ایسا سلوک اچھی بات نہیں۔  
وہ خود کہاں آ رہے ہیں۔ ان کو تو بلایا جاتا ہے  
تم صرف انکار کر دینا۔“

اور نامہ نے بھیلے کے کہنے سے پہلے ہی کون سی  
بان کر دینی تھا۔ چنانچہ وہ مطمئن ہو کر بیٹھ گئی۔ دوسرے روز  
خلاف معمول نامہ نے اچھا لباس پہن لیا۔ اور ان لوگوں کا انتظار  
کرنے لگی۔ جو اس کو پہنچانا چاہتے تھے۔

شام سے ذرا پہلے۔ دونوں این ایک کار  
میں ہمارے گھر آئیں۔ امی نے اور میں نے ان کا استقبال کیا۔  
جبکہ میں ان کے استقبال کے حق میں نہ تھی۔

بھابی انہیں ڈرائنگ روم میں لے گئیں۔ اور وہاں  
باتیں ہونے لگیں۔

کمرے میں چلی گئی۔ وہ اداس بیٹی تھی۔ میں نے کہا۔

”آؤ نامرہ۔ امتحان کا وقت آن پہنچا ہے۔ بلاؤ

اور انہی خواتین کی امیدوں کو خاک میں ملا دو۔

نامہ ناساموٹا سے اٹھتی - اور سبک خراہی سے چلتی

ہوئی ڈرائنگ روم میں پہنچی — خواتین نے اسے  
ایک نظر دیکھا تو حیران رہ گئیں — اتنی خوبصورت - اتنی پیارنا  
لڑکی - ان کے تو خیال میں بھی نہ تھا - کہ وہ آسمان کی کسی حور  
کارشتہ مانگنے آئے ہیں - ایک خاتون نے جو شاید اس لڑکے کی  
جس کے لئے رشتہ مانگا جا رہا تھا - مانگتی اٹھ کر ناصرہ کو سینے  
سے لگانا چاہا - مگر ہزار گتے ناصرہ نے اسے پرے ہٹا دیا -  
اور نہایت خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گئیں — میں  
اس کے سنانے والے صوفے پر بیٹھ بیٹھی — کچھ دیر تو کوئی بات  
نہ ہوئی — کیونکہ ناصرہ کے رویے نے اور اس  
کے حسن نے سب کو خاموش کر دیا تھا — آخر ایک  
خاتون بولی -

”جی ہاں“ — نامرہ نے جواب دیا۔ بالکل

”کیا مطلب؟“ — وہ چونک پڑیں۔

مرغیہ بیٹے جادو نامہ کو بلا لاؤ ۛ

”جی اچھا۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ اور نافرہ کے

امی دوسرے کمرے میں جا چکی تھیں۔ کیونکہ ابابہر سے آگئے تھے۔ اور انہوں نے امی کو کسی مزدوری کام سے آواز دی تھی۔

”مطلب سے کیا ہوتا“ نامرہ نے مسکرا کر جواب دیا۔ افسوس میں اتنے اہم مسئلے پر خود آپ سے بات کر رہی ہوں۔

”کوئی حرج نہیں۔ اس خاتون نے کہا۔

”ہم آزاد خیال لوگ ہیں۔ ہم ایسی باتوں کی برداہ نہیں کرتے۔“

”اور میں آزاد خیال لڑکی نہیں۔ اس لئے آپ کا اور میرا نباہ نہیں ہو سکتا۔“

نامرہ نے جواب دیا۔

خواتین چونک پڑیں۔ اور خاموش ہو گئیں۔ نامرہ نے پھر خود ہی کہنا شروع کیا۔

”بہتر ہے کہ آپ اپنا وقت خراب نہ کریں۔ میں

کسی بھی قیمت پر شادی نہیں کروں گی۔“

”مگر۔۔۔۔۔ کبھی تو شادی کرنا ہوگی بیٹی۔ اتنی

پہاڑی زندگی اکیلے میں کیسے بسر ہو سکے گی۔؟“

ایک خاتون نے جواب دیا۔

”جب اس کا وقت آئے گا دیکھا جائے گا۔ نامرہ

نے جواب دیا۔ آپ لوگوں کو اس بارے میں فکر مند

ہونے کی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔ اور اُس سنو۔ میں

نے ایک نوجوان کو پسند کر لیا ہے۔ میں غیر مالک میں اعلیٰ

تعلیم کے لئے جا رہی ہوں اور واپسی پر اس سے شادی

کروں گی۔“

عورتیں گھبرا گئیں۔ اور ایک دوسری سے کھسک پھسک

کرنے لگیں۔ امی نے نامرہ کے منہ سے یہ آخری فقرہ سن لیا

تھا۔ کچھ دیر بعد مزید کوئی بات کئے بغیر وہ خواتین چلی گئیں۔

ان کے جانے کے بعد امی تو گویا پھٹ پڑیں۔ انہوں نے

ابا سے کہا۔

”جی میں کتنی ہوں آپ نے سنا نامرہ نے ہماروں کو

کہا جواب دیا ہے۔“

”نہیں تو۔۔۔۔۔ ابا نے جواب دیا۔

”امی نے بڑے مرشح مصالحے لگا کر بتایا کہ نامرہ نے

ان سے کہا ہے۔ کہ میں ایک نوجوان سے پیار کرتی ہوں۔ اور

غیر مالک سے واپس آکر اس سے شادی کریں گی۔“

ابا سوچ میں پڑ گئے۔ وہ خاموش خاموش تھے۔

امی نے کہا۔

”میں نہ کہتی تھی وہ ادا رہ اور بدتمیز لڑکی ہے۔ اس نے نوجوان لڑکوں سے تعلقات بنار کھے ہیں۔

میں سب سن کر خون کے گھونٹ پی رہی تھی۔ میرے لئے یہ نامکن تھا کہ ابا اور امی کی باتوں میں دخل اندازی کروں۔ چنانچہ میں نے خاموشی میں عافیت خیال کی۔ ابا نے آواز دی ”نامرہ بیٹی ذرا آؤ۔“

نامرہ ابا کا بے حد احترام کرتی تھی۔ وہ جلدی سے اپنے کمرے سے نکلی اور ابا کے حضور پیش ہو گئی۔ ابا نے کہا۔

”نامرہ بیٹی تم نے مہمانوں کو کیا جواب دیا تھا؟“

”امی نے جو کچھ بتایا ہے وہ بالکل درست ہے۔ میں نے مہمانوں سے یہی کچھ کہا تھا۔“

نامرہ نے جواب دیا۔

”تو تم نے خود کسی نوجوان کا انتخاب کر لیا ہے۔“ ابا نے

اسی لمحے میں کہا۔۔۔۔۔ کوئی بات نہیں۔ ہمیں اس سے ملاؤ۔ تاکہ ہم مناسب بات چیت کر سکیں۔

”جی“۔۔۔۔۔ نامرہ نے کہا۔ وہ شرم سے پانی پانی پر گئی۔ اس نے خود بہ قیاس پوچھا کہ کیا۔

”جی وقت آنے پر آپ کو سب معلوم ہو جائے گا۔“

ابھی اس کی ضرورت نہیں۔“

”مگر کیوں؟“۔۔۔۔۔ ابا نے پوچھا۔

”ابھی میرا شادی وغیرہ کا بدو گرام نہیں۔“

نامرہ نے جواب دیا۔

غصے سے میرا خون کھول اٹھا۔ تو نامرہ نے کسی اور

نوجوان کو پسند کر لیا ہے۔ یہ نامرہ نے اچھا نہیں کیا۔

اس نے بھیا سے غدارمی کی ہے پھر مجھے خیال آیا۔ بھیا

نے اس سے کون سی وٹائی ہے۔۔۔۔۔ ابا نے پوچھا

”لڑکا کیا کام کرتا ہے؟“

”ہسپتال میں میرے ساتھ ڈاکٹر ہے۔“

نامرہ نے جواب دیا۔

”بیٹے یہیں انتظار نہیں۔۔۔۔۔ مگر اگر کام ہمارے

ذریعہ ملے پا جائے تو زیادہ باوقار طریقے سے ہوگا۔“

ابا نے کہا۔

”خدا کرے ایسا ہو جائے؟“

نامرہ نے سر دھجھ کر جواب دیا۔

نہ جانے وہ ایک دم کیوں اتنی بے باک ہو گئی تھی۔ کہ ابا

کے سامنے، سامنے پائیں کر رہی تھیں۔

پھر وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔۔۔۔۔ جس تیزی سے

اس کے کمرے میں پہنچا — میں نے چلا کر کہا —  
 ”نامرہ وہ نوجوان کون ہے جس کا تم نے ابھی ابھی ابا اور  
 امی سے ذکر کیا ہے تم“

”ہے ایک“ نامرہ نے جواب دیا۔

”نامرہ“ — میں غصے سے چیخنی — تم غلط

قدم اٹھا رہی ہو۔ تم ہمارے اعتماد کو دھوکا دے رہی ہو  
 میں نے تو . . . . .

”تمہیں بھابی بنا دیا تھا —“

نامرہ نے دہرایا۔

اور میں کٹ کر رہ گئی۔ نامرہ نے کہا —

”رضیہ بہن تمہارا نصفہ بجا ہے۔ مگر غور کرو اگر تمہارے

بھیا کسی اور سے شادی رچا سکتے ہیں۔ تو مجھے یہ حق کیوں

حاصل نہیں؟“

میں کیا جواب دیتی۔ خاموش رہی۔ پھر اس نے خود ہی

کہا

آپ سب نے پردگراں بنایا تھا کہ اس کے باوجود میں

انتظار کروں۔ اور لندن میں آپ کے بھیا سے شادی کر

لوں۔ میں اب بھی اس کے لئے تیار ہوں۔

اور میں نے . . . . .

مگر وہ نوجوان — میں نے بات کاٹ کر کہا۔

”آپ کے بھیا؟“

نامرہ نے جواب دیا۔

”نامرہ“ — میں نے محبت سے کہا۔ تم نے تو

مجھے بھی پکرا دیا تھا — خدا کا شکر ہے تم نے کوئی غلط  
 قدم نہیں اٹھایا۔

”پہلے غلط قدم کی سزا مل رہی ہے۔“

نامرہ نے جواب دیا۔

اور ہم دونوں مسکرا دیں — بھائی جان آرہے تھے

— وہ نامرہ کے لئے سیب لانے تھے۔ اور اسے

دے کر چلے گئے۔ میں نے میز سے ایک سیب اٹھایا — اور

اس کی رنگت سے نامرہ کے گالوں کا موازنہ کرنے لگی۔



آہورفت کی رحمت بھی مڑاٹھانا پڑے ۔  
 سائیکہ کے ابا نے بھی اسے بہتر خیال کیا پہنانچہ وہ سائیکہ کو  
 لے کر آ رہے تھے ۔

دوسرے روز سائیکہ کے ابا سائیکہ کو لے کر اپنے  
 ساز و سامان سمیت آن پہنچے ۔ وہ بے حد کمزور  
 ہو گئے تھے ۔ اور بیمار تھے ۔ دو ملازم ابھی سینھائے ہوئے  
 تھے ۔ سائیکہ ان کے ساتھ ساتھ تھی ۔ میں نے ان کا استقبال کیا  
 میرے کمرے میں سائیکہ کے ابا کا بستر گادیا گیا ۔

اور میرا د سائیکہ کا بستر بھیائے کمرے میں چلا گیا ۔ جبکہ  
 بھیا کو ڈرائنگ روم میں منتقل ہو نا پڑا ۔ امی نے بھیا سے کہا  
 ”دیکھو سلیم بیٹے ۔ اب سائیکہ تم سے پردہ کرے  
 گی ۔ رواج بھی تو پورے کرنے ہوتے ہیں ۔ وہ  
 اگر کبھی سامنے آجائے تو تم خود پرے ہوٹ جایا کرنا ۔ کیونکہ  
 ایسا کرنا ضروری ہے ۔“

”جی دچھا امی جان ۔“ بھیا نے جواب دیا ۔

”اور ایک بات مزید یاد رکھو ۔“ امی نے بتایا ۔

”ان دنوں کوئی حرکت نہ کر بیٹھنا ۔ جس سے بیماری  
 ناک کٹ جائے ۔“ سائیکہ تمہارے کمرے  
 میں رہے گی اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو ملانم کو یا اپنی بہن کو



ننگی کا دن قریب آ رہا تھا ۔ اور ہم سب کا  
 اضطراب بڑھ رہا تھا ۔ جبکہ امی بے حد خوش نصیب  
 گویا خاندان بھر کی خوشیاں امی کی صند کی بھینٹ چڑھ رہی  
 تھیں ۔ آخر ایک شام ہمیں ایک تار ملا ۔ یہ تار سائیکہ کے  
 ابا کا تھا ۔ انہوں نے لکھا تھا ۔ میں سائیکہ  
 بیٹھائے ساتھ کل صبح پہنچ رہا ہوں ۔ کیونکہ شادی کی رسومات  
 کی ادائیگی ہمارے گھر میں ہوگی ۔ یہ بات درست  
 بھی تھی ۔ کیونکہ مامہ کے ابا بیمار تھے ۔ وہ کہاں اتنے  
 زیادہ بہتر طریقے سے انجام پا جائیگا ۔ اور ہر بات کو



کھل کر بات کرو

سائمہ نے گھبرا کر کہا۔

”چند روز بھیا سے تمہارا نکاح ہو جائے گا۔ اور تم نہیں جانتی سائمہ اس کا انجام کیسا بھیا لگ ہو گا۔ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اور شاید یہ شادی سو ہی نہ ہو سکے۔ عین موقع پر یہ شادی منسوخ ہو جائے گی۔“

کیا کہہ رہی ہو؟

سائمہ نے پوچھا۔ اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے تھے۔

”ٹھیک کہتی ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”تمہیں معلوم ہے بھیا ناصرہ سے پیار کرتے ہیں۔ اور تم سے نفرت کرتے ہیں۔ وہ کسی بھی صورت تمہیں بڑی کاحیثیت سے قبول نہ کریں گے۔ اور تمہاری زندگی کو خواہ مخواہ ایک روگ لگ جائے گا۔ سائمہ تم خوشیاں حاصل نہ کر سکو گی۔“

”تم نے تو کہا تھا کہ سائمہ خوشیاں جاؤ کہ ناصرہ نے خود بھیا کو چھوڑ دیا ہے۔ وہ روٹن خیال لڑکی ہے۔ وہ کسی پر مسلط ہونا پسند نہیں کرتی۔“

”تب کی بات اور تھی۔“ میں نے جواب دیا۔

”اب حالات اور ہیں۔ وہ ہر حالت میں ناصرہ کو اپنا“

آواز دے کر شکوایا۔

”آپ اطمینان رکھیں امی۔“ میں نے جواب دیا۔  
”جیسا آپ چاہتی ہیں ویسا ہی ہو گا۔“

اور امی خوش ہو گئیں۔ ابھی نکاح میں چند روز باقی تھے۔ اسی رات میں نے سائمہ سے اس بارے میں آخری اور فیصلہ کن بات چیت کا پروگرام بنایا۔ مناسب موقع پر میں نے سائمہ سے کہا۔

”سائمہ باجی ایک بات کہنا چاہتی ہوں اگر تم میں اتنا حوصلہ ہو کہ اسے من سکو۔“

”ایسی کون سی بات ہو سکتی ہے۔ جسے سننے کے لئے پتھر کا دل چاہیے؟“

سائمہ نے جواب دیا۔

”غیر وہ تو پہلے ہی ہے۔“ میں نے کہا۔

”کیا مطلب؟“ سائمہ نے گھبرا کر کہا۔ کیا میرا دل پتھر ہے؟

”چھوڑو ان باتوں کو۔“ میں نے جواب دیا۔

”میں تو صرف اس قدر کہنا چاہتی ہوں کہ اگر تم چاہو تو اب بھی اپنا زندگی خراب ہونے سے بچا سکتی ہو۔ ابھی موقع ہے بعد میں کیا وقت ہا قہ نہیں آئے گا۔“





سامنے نے سب کی توجہ دوسری طرف لگائی اور نظر پکڑ کر نافرہ کی  
پہیلی سے اپنی چائے کی پہیلی بدل کر لی۔ گو میں نے سب کچھ اپنی  
آنکھوں سے دیکھا مگر میرے تو وہ ہم گان میں بھی نہ تھا۔ کہ نافرہ  
کے خلاف وہ اتنا زبردست انتقام لے گی۔ کہ اسے چائے میں  
زہر دے کر ہلاک کرنے کی کوشش کرے گی۔ نافرہ نے وہ گھونٹ  
پئے تو منہ بنایا۔ اسے ذائقہ خراب معلوم ہوا۔ میں نے موقع کی  
نزاکت کو تاڑ لیا۔ اور نافرہ سے پوچھا۔

”کیا بات ہے؟ چائے بد ذائقہ سی ہے۔ نافرہ نے سب  
عادت مسکرا کر جواب دیا۔

اف میں نے سوچا تو سامنے نے اتنا اوجھا بتھیا راستہ  
کیا۔ میں کاپ گئی۔ زہر۔ تو کیا نافرہ خدا بد کرے مر جائے گی۔  
میں چلائی۔ ”بھیا ذرا آؤ۔“ نافرہ نے زہر پکڑ لیا ہے؟  
جیسا ڈر ہنگ روم میں تھے۔ سمجھ پانڈیوں کو نظر انداز  
کر کے بھیا اندر آ گئے۔ اور نافرہ کو بروقت قبل اطلاع دی گئی  
اسے پے درپے قے کراہی گئیں۔ ٹینگ لگائے گئے۔ جس سے اس  
کی حالت سنبھل گئی۔ بھیا نے تو اسے چلانے کے لئے سر دھوک  
بازی لگا دی۔ بمبائی جان۔ ابا۔ امی اور سب جج ہو گئے۔ دیکھ  
روز نافرہ ٹھیک ہوئی تو ابانے کہا سنا نافرہ بیٹا تم نے خود کشی  
کی کوشش کیوں کی تھی۔ بتاؤ تمہیں کیا تکلیف ہے؟



سامنے نے نافرہ سے انتقام لینے کا پروگرام بنایا تھا۔ اور  
اسے وہ عملی شکل دینا چاہتی تھی۔ ادھر یوں مصلو ہو تا تھا جیسے  
وہ کوئی آخری فیصلہ کر چکی ہو۔ وہ زخمی ناگن بن گئی تھی۔  
جس کا خیال تھا کہ وہ جو بھی سامنے آئے اسے ڈس لے گی۔  
میں اس سے چو کہنا ہو گئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ مزور ادچھا  
دار کرے گی۔ اور نافرہ کو ایک بار پھر بدنام کرنے کی کوشش  
کرے گی۔ مگر یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ نافرہ کی  
زندگی تک لینے کی کوشش کرے گی۔  
تیسرے روز شام کو عجب ہم چائے پینے بیٹھے تو اچانک

”جی حنا مرہ نے سب عادت چورنگ کر لیا۔“ خود کشی میں اسے  
حرام خیال کرتی ہوں۔ میں نے خود کشی کی کوشش نہیں کی۔  
بلکہ مجھے کسی نے زہر دیا تھا۔“

”کسی نے نہ ہر دیا تھا۔“ بھائی جان حیران رہ گئے  
”اے دو میرے کسی بچے کا نام۔“

امی نے غصے سے دانت پیس کر کہا  
”تم خاموش نہ ہو۔“ ابانے امی کو گھورا۔

”جی ہاں اور یہ ہمیں خواہ مخواہ حد التوں کے چکر لگوانے۔  
اگر مرنا ہی تھا بس کے پیچھے سردے دیا ہوتا۔“  
امی چلا لی۔

”امی آپ خدا کے لئے خاموش رہیں۔“ بھائی جان گڑ گڑائے  
وہ بے حد فکر مند تھے۔ انہیں یقین تھا کہ نادرہ نے خود کشی کی ہے  
اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سائیکہ اور بھیا کی شادی سے بددل  
ہو گئی ہے۔ بھیا نے کہا۔  
”جو اب دو نادرہ“

نادرہ بھلا کیا جواب دیتی اور اگر میں کوئی بات کرتی تو میں  
جانتی تھی کہ معاملہ کتنا طول کھینچ جائے گا۔ اور میں یہ کبھی  
بھی ثابت نہ کروں گی کہ نادرہ کو واقعی سائیکہ نے زہر دیا ہے۔  
چنانچہ میں نے خاموشی ہی میں عافیت خیال کی۔ نادرہ نے کہا۔

”میں نے خود کشی کرنا چاہی تھی۔“  
”مگر کیوں؟“

ابانے پوچھا۔

”اس لئے میں زندگی سے اکتانگئی ہوں میں اپنے ارد گرد کا  
ماحول ایسا نہیں پاتی کہ کسی کو اپنا کہہ سکوں۔ اس لئے میں مرنا  
چاہتی ہوں۔“

نادرہ نے جواب دیا۔

اب ہوئی ہے اصل بات۔ امی نے چلا کر کہا۔

”اگر مرنا ہے تو ہمیں کیوں پریشان کرے گی۔ اور اس خوشی  
کے موقع پر یہی بھی پریشان کرے گی۔ کلمو ہی۔۔۔۔۔“  
کپس کی۔۔۔۔۔“

بھائی جان نے بڑی مشکل سے امی کو دوسرے کمرے  
میں بھیجا۔ میں حیران رہ گئی کہ نادرہ نے کیوں کہہ دیا کہ وہ خود کشی  
کرنا چاہتی تھی۔ جبکہ ایسا نہ تھا۔ اس نے خود کشی کرنی ہوتی تو دو  
گھنٹ چائے پی کر اسے چھوڑ نہ دیتی۔ نادرہ کو تو زندگی  
سے پیار تھا۔

اور وہ بھیا کے لئے۔ اور اپنے ماں باپ کا نام زندہ  
رکھنے کے لئے خود زندہ رہنا چاہتی تھی۔  
اس نے کبھی مرنے کے بارے میں نہ سوچا تھا۔

بھابی جان نے کہا

”نامرہ حالات کا مقابلہ کرنا سیکھو۔ حالات سے شکست کھا جاؤ گی تو دنیا اور آخرت دونوں کو خراب کر لو گی۔ تمہاری قوم کو ضرورت ہے۔ تم ڈاکٹر ہو۔ اپنی زندگی کو ضرورت مندوں کی خدمت کے لئے وقف کر دو۔“

”میں کوشش کروں گی۔“ نامرہ نے بے زاری سے جواب دیا۔ ”خدا کے لئے اب مجھے تنہا چھوڑ دو میرا دم گھٹ رہا ہے۔“

ابا اور بھابی جان باہر چلے گئے۔ بھابی نے سارے ہنگامے میں دخل نہ دیا تھا۔ وہ کمرے میں منے کو سٹار ہی تھیں۔۔۔۔۔ بھیا اور میں نامرہ کے کمرے میں رہے۔ میں نے کہا ”نامرہ تم نے بہت بڑا کیا ہے۔“

”ہاں۔ خود کشی اچھی بات نہیں۔ بھیا نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے جواب دیا۔

”نہیں یہ بڑا نہیں کیا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”بلکہ یہ بڑا کیا کہ زہر دینے والے کا نام نہیں ہے دیا

تو کیا اسے زہر دیا گیا ہے؟“ بھیا نے حیرانی سے سوال کیا۔ ”جی ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔

”مگر کس نے؟“ بھیا نے پوچھا۔

”بتاؤ نامرہ، میں نے کہا۔“

”آپ ہی بتائیں رضیہ باجی۔“ نامرہ نے جواب دیا۔ ”میں نے تو اس کے اس عیب پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی تھی۔“

”بتاؤ نامری وہ کون ہے؟“ بھیا نے پوچھا۔ ”میں اس سے ضرور بدلہ لوں گا۔“

”سبح“ میں نے پوچھا۔

”بے شک“ بھیا بولے۔

”میں بتاتی ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”وہ آپ کا پوتے والی بھیسما لہ ہے۔“

”رجو بہن“ بھیا چلائے اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ سخت بے چین ہو گئے جیسے انہیں اس خبر سے شدید ترین صدمہ پہنچا ہو۔ انہوں نے کہا۔

”آپ کو یہ سب کیسے معلوم ہے۔؟“

”میں نے خود اسے زہر ملائے اور پیالی تبدیل کرتے دیکھا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”کیا تم ہوش میں ہو۔؟ وہ بولے۔

”ہاں ہاں بھیا۔ عقل سے کام لو۔ میں رضیہ ہوں آپ کی

بہن اور آپ جانتے ہیں کہ میں جھوٹ نہیں بولا کرتی ۔ میں نے جواب دیا ۔

”تو معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ وہ سوچنے لگے ۔ پھر انہوں نے نامرہ کا ہاتھ دبا کر کہا ۔

”نامرہ میں تم سے معافی چاہتا ہوں ۔ میں نے غلط سوچا تھا مگر میں بھی مجبور ہوں ۔“

پھر وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئے ۔ وہ بے حد بے چین تھے ۔ انہوں نے نامرہ کو خدا حافظ بھی نہ کہا ۔ اس سے پہلے میں نے انہیں کبھی اس طرح رخصت موتے نہ دیکھا تھا ۔

میں نے کہا ۔

”نامرہ یہ بات مزور رنگ لائے گی ۔“

”کیسے ؟“ نامرہ نے پوچھا ۔

”بھیا کا موڈ بتا رہا تھا کہ وہ کچھ کر کے رہیں گے ۔“

میں نے جواب دیا ۔

نامرہ کچھ نہ بولی ۔ ساکھ انڈراگئی

تھی ۔ ہم خاموش ہو گئیں ۔ وہ نامرہ

سے ہمدردی کر رہی تھی ۔ نامرہ مسکرا

رہی تھی ۔ یہ اس کی عادت تھی ۔ جب کہ میں

خون کے گھونٹ پی رہا تھی ۔ یہ اور کاری یہ داشتہ نہ کر سکتی ۔

اور اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی ۔

سامکھ کے ابا کی طبیعت بھی پہلے سے اچھی تھی۔ اور وہ بیٹی کی خوشی دیکھنے کے لیے ہم سب سے بے تاب تھے۔ سامکھ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ تھا۔ اور نامرہ کے چہرے سے بھی درخشاں غم کے کئی آثار دکھائی نہ دیتے تھے۔ پھر میں کیوں اپنا خون جھاؤں۔ اور کیوں خواہ مخواہ دوسروں کے لئے سردرد مول لوں۔ میں بھی خاموش ہو گئی۔ اور سب معاملہ حالات پر چھوڑ دیا۔ گھر نکاح سے ایک رات پہلے میں نامرہ کے کمرے میں اس غرض سے گئی کہ اس کے تاثرات کیا ہیں۔ تو مجھے دروازے پر رک جانا پڑا۔ کمرے سے بھیا اور نامرہ کی باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

نامرہ بھیا سے کہ رہی تھی۔

”جب سوچتی ہوں کہ آپ کل دہلا نہیں گئے اور دولہا بھی میرے نہیں بلکہ سامکھ کے۔ تو میرا دل دھک سے رہ جاتا ہے۔ میں سوچتی ہوں کاش ایسا ہوتا کہ سامکھ کی جگہ میں ہوتی تب کتنی خوشیاں ہر طرف بکھر جاتیں۔“

”مگر ایسا ضرور ہو گا۔“ بھیا نے جواب دیا۔

”تم دہن ضرور جو گی۔“

”شکر کسی کی؟“ نامرہ نے کہا۔

”جی ہاں۔“

”نہیں“ بھیا نے فرمایا۔



بھیا کی شادی کی قطاریاں زوروں پر نہ ہیں۔ کوئی بھی غیر متوقع حادثہ اس شادی کو روک نہ سکا اور نامرہ کی خود کشی والا واقعہ تو کوئی بھیا کی ہیبت حاصل نہ کر سکا۔ مجھے امید تھی کہ بھیا ضرور کوئی ہنگامہ کھڑا کر دیں گے۔ وہ کم از کم یہ شکر بپا کر کہ نامرہ کو زہر دینے والی سامکھ ہے اور میں ایسی لڑکی سے شادی کرنا نہیں چاہتا شادی سے انکار کر دیں گے۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ بھیا کچھ بھی نہ بولے۔ میں نے بھی بھیا سے کوئی بات نہ کی۔ کیونکہ مجھے امید تھی کہ بہن ضرور میری بات رد کر دیں گے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے بھیا ہم سب کو بے وقوف بنا رہے ہیں۔ اور خود سامکھ سے انکار کرنا تو ان کا ہی مقصد ہے۔



رہا ہے۔ میں تمہیں سے کراس ملک سے نکلی جاؤں گا۔  
 اور سارے میری یادوں کے سہارے زندہ گی گزار دے  
 گی۔ میں اسے طلاق بھی نہیں دوں گا۔ تاکہ اس سے  
 اس بات کا انتقام لے سکوں کہ اس نے تمہیں زہر دیا  
 ہے۔ میں اس کی زندگی میں زہر بھج دوں گا۔ میں اسے  
 کہیں کارنچھوٹوں گا۔ میری ذہنیں تم ہو۔ اور میں نہیں  
 بچا اپنا سب کچھ خیال کرتا ہوں۔  
 ”تو بھیا یہ سوچ رہے ہیں۔“

میں نے آہستہ سے خود سے کہا۔

”گھر۔ ماؤ کو اتنی بڑی سزا نہیں ملنا چاہیے۔ یہ شادی  
 ملتوی ہو جیانیے در نہ مجھ سے ناامید اور بھیا ہمیشہ کے  
 لئے بچہ چاہیں گے۔ سب کی زندگیوں کو بگاڑ دیا جائے گی۔ اور  
 اور یہ بچہ ہمیشہ کے لئے جہنم بن جائیگا۔ میں اپنی جان  
 کی قربانی دوں گی۔ مگر کچھ تین افراد کو تباہ ہونے سے  
 بچاؤں گی۔“

میں نے آخری فیصلہ کر لیا۔ بھیا کہہ رہے تھے۔

”رضیمہ باجی نے ہمارے لئے جو کچھ کیا ہے وہ ہم کبھی فراموش  
 نہ کریں گے۔ دراصل میں ایک دوسرے سے وابستہ  
 نہ کہنے میں ان بڑا بات ہے۔“

میں نے خوشی سے ہلکی جانی۔ تو بھیا اور نامہ میرے بعد  
 میری قربانی یاد رکھیں گے۔ اور میرا نام احترام سے  
 لیا کریں گے۔ مگر میں انکا یہ پروگرام بھی پورا نہ ہونے  
 دوں گی۔ کہ وہ سارے کو تباہ کر دیں۔ آخر وہ میری شامل زاد  
 بہن ہے۔ اس کا اس میں کیا قصور ہے کہ بھیا سے پیار  
 کرتی ہے اسے ذرا سی ہڈی اتنی سنگین سزا نہیں ملنی چاہیے  
 میں اسے بھی بچاؤں گی۔

بھیا نے فیصلہ کر کے میں اپنی جگہ مطمئن ہو گئی۔

بھیا نامہ کے کمرے سے باہر گئے تھے۔ اور میں بھی اپنی  
 سہجوں کی دنیا سے لوٹ آئی تھی۔ اور پھر وہ دن بھی آ پہنچا۔  
 جب بھیا اور سارے کا نکاح ہونے والا تھا۔

گھر کو دہلی کی طرح سجایا گیا تھا۔ اسی اور بابے سند  
 خوش تھے۔ گھر کے باہر گراؤنڈ میں شادی لگائے گئے تھے  
 نواری کرسیوں پر دہلی بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ بھائی  
 جان بھی بڑی خوشی خوشی اور تیزی میں کام کرتے پھر رہے  
 تھے۔ آخر ان کے پیارے بھائی کی شادی تھی۔ وہ خوشی نہ  
 مٹانے تو اور کون خوشی مٹاتا؟ نکاح رات کو ہونا تھا۔  
 گھر کو اندر اور باہر سے رنگین برقی قہقروں سے سجایا گیا تھا  
 جو پنی رات ہوئی گھر برقی قہقروں سے جگمگاٹھا

۴ بات یہ ہے کہ بھیانک سے شادی ہو چکا ہے۔  
چاہتے ہیں نے کہا۔

۔ مگر میرا فیہ حسد اکل تھا۔ یہیں سے اہستہ سے ساکھ تے

”وہی پرانی بات ہے۔“ سالمہ نے سمجھی سے کہا۔

”ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”بات جو پرانی ہے۔“

”نہر اس کا رنگ اب کے نیا ہے۔“ دیکھوں میں نہیں بتانا

چاہتی ہوں کہ بھیا کا پر دگرا کر گیا ہے تو

”بتاؤ۔“ سالمہ نے ٹکڑے سے کہا۔

”پہلے تو وہ تم سے شادی کرنا ہی نہ چاہتا تھا۔“ اور جب اسی

اور اب نے مجبور کر دیا تو انہوں نے تمہیں طوق بکھ کر رکھنے

ڈالنے کا فیصلہ کر لیا۔.....“

”یہ غلط ہے۔“ سالمہ چلائی۔ ”تم میری خوشیاں خود خواہ

دینی انداز کر رہی ہو۔ تمہیں ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔“

”سالمہ! سنتی رہو۔“ میں نے چلا کر کہا۔ ”اب بھیا کا پر دگرا کر گیا اور

ہے۔“ تم میری خانہ زاد بہن ہو، تم پر میں بھی ظلم ہوتے ہیں

دیکھنا چاہتی۔ بھیا کا خیال ہے کہ وہ شادی کے بعد نامرہ

کے ساتھ غیر محالک میں چلے جائیں گے۔ وہاں وہ نامرہ سے

شادی کر لیں گے۔ اور پھر کبھی وطن واپس نہ آئیں گے۔ اور

ان تمام غمراہیوں کو نہ بھولے گا۔“ مگر بھیا۔ وہ نہیں سمجھی

اس رنگے۔ وہ نہیں اتنی بڑی سزا دینے کے لئے یہ ڈرامہ

۔ مگر یہ۔“

کان میں بات کی ہے، سالمہ نے پوچھا۔ اس کی آواز

میں کپکپاٹ شامل تھی۔

”یہ سزا اس بات کی ہوگی کہ تم نے انہیں بار بار تنگ کیا

۔ تم نے نامرہ پر الزام لگائے۔ اور پھر اسے زہر دینے

کی کوشش کی۔“ اگر ہر وقت وہ اعلان دیتے تو

نامرہ تو مر گئی ہوتی۔“

”یہ غلط ہے۔“ وہ چلائی۔ ”میں نے کسی کو زہر دینے کی

کوشش نہیں کی۔“ میں قائل نہیں ہوں۔ وہ غلط سمجھتے

ہیں۔“

”سب نے تمہیں زہر دیتے دیکھا ہے۔“ میں نے

جواب دیا۔ ”یہ الگ بات ہے کہ کوئی بھی یہ بات تم سے نہ

کہے۔“ خود میں نے نہیں دیکھا تھا کہ تم نے بات بدل کر نامرہ کی

پیالی سے اپنی پیالی بدل لی تھی۔ اور تمہاری پیالی میں زہر شامل

تھا۔“

”رضیہ بہن۔“ وہ چلائی۔ ”خوف سے اس کے منہ سے الفاظ

نہ نکلی سکے۔“ میں نے کہا۔

”سالمہ! تم نے اگر ہمارے گھر کی خوشیاں چھین

لیں۔ اور اب نہ ننگی بھر کے لئے ہم سب تمہاری وجہ

سے کبھی خوش اندرہ سکیں گے۔ اس لئے میں یہ شادی نہ ہوں

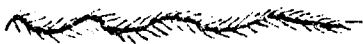
دوں گی۔“

”ہنسی“ وہ چلائی۔ ”ایسا نہیں ہو سکتا۔ اب ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“  
 ”ایسا ضرور ہو گا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں اپنی جان کی قربانی دوں  
 گی۔ اور میری موت کے باعث یہ شادی ٹل جائے گی۔ میں  
 نے وصیت لکھ دی ہے کہ میں اس لئے خودکشی کر رہی کہ یہ  
 شادی رک جائے۔ اور میرے بعد رانا مرہ اور بھیما کی شادی کر  
 دی جائے۔ تاکہ یہ گھر تباہ نہ ہو۔“  
 ”نہیں۔“ سائیکہ نے جواب دیا۔ ”تم خودکشی نہیں کرو گی۔ تم میری  
 بہن ہو۔ میں تمہارے لئے قربانی دوں گی۔“  
 ”ہنسی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”بھلی بھلی لڑکی تار تار مجھے ایک منٹ  
 میں ہلاک کر دے گا۔ اور پھر یہ شادی بھی رک جائے گی۔ یہاں  
 سے ڈول نہیں بلکہ جنازہ نکالے گا۔“  
 میں نے بھلی کے اس ننگے تار کی طرف اشارہ کیا جو میں نے پہلے  
 سے تیار کر رکھا تھا۔ سائیکہ سہم گئی۔ میں نے کہا۔  
 ”تم رشہ کر دے میرے بعد خود بھی شادی سے انکار کر دو گی۔“  
 ”مگر تم ختم نہیں ہو گی۔“ سائیکہ نے کہا۔ ”مجھے یوں معلوم ہوا جیسے  
 اس نے کوئی آخری فیصلہ کر لیا ہو۔ پھر میں نے کہا۔  
 ”اچھا خدا حافظ۔ اور جو اپنی جان تار کو چھونے لگی۔ میں جیوان رہ گئی  
 سائیکہ نے چہل کر وہ تار پکڑ لیا۔ ایک چونکا رہی سی نکلی اور پھر  
 ایک چیخ بلند ہوئی۔ سائیکہ بھلی کے تار سے چٹکئی مٹتی۔

میں میں سوچا بند کرنے دوڑی۔ چیخ کی آواز سے گھر بھر میں  
 شور بلند ہوا۔ اور سب میرے کمرے کی جانب دوڑے اور حجب  
 میں سوخا بند کر کے واپس آئی تو گھپ اندھیرے میں کچھ بھی نہ دیکھ  
 سکی۔ میں نے پھر سوچا کہ ان کو دیا۔ سائیکہ زمین پر سیدھی پڑی آنکھیں  
 صاف لے رہی تھی۔ امی چلائی۔ ”سائیکہ یہ کیا ہو گیا۔“  
 اس کے چہرے پر مسکراہٹ پیدا ہوئی اور اس نے آخری ہچکلی کی  
 اور وہ ختم ہو گئی۔

بھیا اور رانا مرہ بھی اندر لڑ گئے۔ انہوں نے طبی امداد دینے  
 کی کوشش کی۔ مگر وہ ختم ہو چکی تھی۔ سائیکہ کے ابا  
 کو تپہ چلا۔ وہ تودل کے مریض تھے۔ انہوں نے کوئی  
 بات بھی نہ کی۔ اور ان کا ہاٹ فیل ہو گیا۔

اس طرح گھر میں دو موتوں کی وجہ سے ساری خوشی  
 درہم برہم ہو گئی۔ اور شادی کا تو سوال ہی نہ رہا۔  
 کیونکہ دہن اتنے صاف کہ بیماری ہو گئی۔ امی کا بھی  
 بڑا حال تھا۔



خدا کو یہ منظور تھا کہ سالہ آپ کی بہن بن سکی  
نکرا ب میری خواہش یہ کہ نامہ اور سلیم کی شادی کردوں  
بھائی جان نے کہا۔

”ہنس“ ————— اکی گویا رو دیں۔ ————— ”میری  
بیٹی کے بعد اب نامہ اس گھر کی ہو نہیں سکتی۔“  
”گھر امی نامہ کا کپنصور ہے۔“  
بھائی جان نے کہا۔

”وہ تو آپ کو ناں خیال کرتا ہے۔ اسے بیٹی کا  
پیار دیکھیے۔“

کبھی اسے ہنس کر بات تو کیجئے پھر دیکھیے وہ کیسی  
پیاری باتیں کرتی ہے۔ یہ میری خواہش ہے امی کہ اسے  
سلیم کی بیوی اور اپنی بھانجی بنائوں۔“  
امی ہنسنے لگی۔ بھائی جان نے نامہ  
کو آواز دی۔ ————— وہ اٹکی۔

”بھائی جان نے کہاں

نامہ امی کے پاس بیٹھو۔“

نامہ امی کا پاس بیٹھ گئی۔ بھائی جان بولے

”ابا کو میں سناؤں گا۔ ————— آپ اپنی کر دیں۔ اور نامہ  
کو سینے سے لگا لیں۔ بس اتنا بہت ہے۔“

شادی رک جانے سے بھیا کو سکون تھا۔ اور نامہ بھی  
کسی قدر مطمئن تھی۔ ————— امی اداسی اداس رہتی تھیں  
بھیا نے کوئی بات نہ کی۔ ————— اور اس طرح تین ماہ  
کا مرحلہ گزر گیا۔ ————— ایک روز بھائی جان نے امی  
سے کہا۔

”امی ایک بات کہوں؟“

”ہاں کہو“ امی نے کہا۔ وہ سالہ کے بعد مر بھائی سی  
رہتی تھیں۔

”اگلے ماہ سلیم لندن چلا جائے گا اور نامہ بھی۔“

امی نے کچھ دیر نامرہ کو دیکھا اور پھر انہوں نے میری بیٹی کہہ کر نامرہ کو سینے سے لگایا۔

میں سب کچھ دیکھ رہی تھی۔۔۔۔۔ نامرہ بلک کر رو پڑی۔ جیسے وہ اپنی ماں سے مدت بعد ملی ہو۔ اور شکریے کہہ رہی ہو۔۔۔۔۔ امی بھی رو پڑیں

میرے آنسو نکل اُسے۔ مگر خوشی کے

امی نے کہا۔

”اچھا بیٹے جو تمہاری خوشی وہ میری۔

مجھے منظور ہے۔ جیسا تم چاہو۔“

میں محسوس اٹھی۔

نامرہ کے پہرے پر بھی خوشی کی سرخی

چھا گئی۔ اور شرمنا کر وہ اپنے کمرے میں بھاگ آئی

میں بھی اس کے پاس گئی۔ ٹشوٹری سے پکڑ

کہ میں نے اس کا سر اٹھایا اور آہستہ سے کہا۔

”کیا حال ہے نامرہ بھابی؟“

اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔

دوسری شام بھیا نے مجھے سرخ ساٹھی لاکر دی۔ اور

آہستہ سے بولے۔

”دھو باجی۔“

اس سے ملاقات تو کرو۔“

”کس سے؟“ میں نے نہ بولا۔

”نامری سے؟“ بھیا نے کہا۔ اور خود ہی شرم

سے لگے۔

میں نے کہا۔

”پندرہ دن بعد شادی ہے بھیا۔ خوب جی بھر

کر دیکھو ایسا۔ اب پس۔“

اور پندرہ دن بعد نامرہ اور بھیا میاں

بیوی کی حیثیت سے لندن کے لئے روانہ ہو گئے تھے

ہوائی اڈے پر میں نے جب اسے سینے سے

لگایا۔ تو اس کا سر چوم لیا۔ اور۔۔۔۔۔

آہستہ سے کہا۔

”جلد لوٹ آنا۔ نامرہ بھابی میں آپ سب

کا انتظار کروں گی۔۔۔۔۔ اور مجھے

اس نے کا بھی انتظار ہو گا۔ جو تمہاری واپسی پر شاید

ایک سال کا ہو گا۔“

”شیر کہیں کی؟“ نامرہ نے میرے گال پر ایک

چھیت رسید کی۔

جہاز چنے کو تیار تھا۔ بھیا اور نامرہ سوار ہو گئے

